

نوجوانوں کے لئے

اصول عقائد کے پچاس سبق

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ: سید قلبی حسین رضوی

مجمع جهانی اہل بیت علیہم السلام

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتیٰ نئے نئے پوڈے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچے و کلیاں رنگ و نکھار پیدا کر لیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ و راه اجالوں سے پر نور ہو جاتے ہیں، چنانچہ متمن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ و موسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم و آگی کی پیاسی اس دنیا کو چشمہ حق و حقیقت سے سیراب کر دیا، آپ کی تمام الہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقاء بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمت اب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمران ایران و روم کی قدیم تہذیبیں کا اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑ گئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہب عقل و آگی ہے روبرو ہونے کی توانائی کھو دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غالبہ حاصل کر لیا۔

اگرچہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ گرانہامیراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کے بے تو جہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے مبتلا یوں کاشکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کر دی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پرواکے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمہ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشوار دنیا کے اسلام کو تقدیم کئے جنہوں نے یہ وہی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجودوں کی زد پر اپنی حق آگیں تحریریوں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشتپناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور رمکتب اہل بیت علیہ السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکر و معنوی قوت و اقتدار کو توثیق کے لئے اور دوستدار اسلام سے اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنارشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامران زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ عملی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا کو پہنچانے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(علمی اہل بیت گو نسل) مجمع جهانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیت عصمت و طہارت کے پیروں کے درمیان ہم فکری و بیکھنی کو فروع دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فرائضہ ادا کرے، تاکہ موجود دنیا کے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس

مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہو سکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار مہر انہ انداز میں اگر اہل بیت عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوت و رسالت کی جاوہ وال میراث اپنے صحیح خود خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن، انسانیت کے شکار، سامراجی خواہ خوار اس کی نامہ نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوت اور کے ذریعہ امام عصر (ع) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفوں کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنی خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، فاضل مولف آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی گرانقدر کتاب ”نوجوانوں کے لئے اصول عقلائد کے پچاس سبق“، کوفاصل جلیل مولانا سید قبیلی حسین رضوی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزو مند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونیں کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جھنوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنی جہادِ رضاۓ مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الأكرام  
مدیر امور ثقافت، مجمع جهانی اہل بیت علیہم السلام

سم

عرض ناشر.....	۷
معرفت خدا کے دس سبق.....	۲۵
پہلا سبق: خدا کی تلاش.....	۲۶
کائنات سے واقفیت کا شوق.....	۲۶
شکر گزاری کا احساس.....	۲۷
خدا کی معرفت سے ہمارے نفع و نقصان کا تعلق.....	۲۸
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۳۰
دوسرा سبق: خدا کے وجود کی نشانیاں.....	۳۱
خدا کی معرفت اور علوم کی ترقی.....	۳۱
خدا کی معرفت اور تلاش و امید.....	۳۳
خدا کی معرفت اور ذمہ داری کا احساس.....	۳۳
خدا کی معرفت اور سکون قلب.....	۳۴
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۳۶
تیسرا سبق: خدا کی معرفت کے دو اطمینان بخش راستے.....	۳۷
اندر ہونی راستے.....	۳۸
ایک سوال.....	۴۰
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۴۲
چوتھا سبق: ایک اہم سوال کا جواب.....	۴۳
سوال.....	۴۳
جواب.....	۴۳
بحث کا نتیجہ.....	۴۷
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۴۸
پانچواں سبق: ایک پیقاواقعہ.....	۴۹
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۵۲

چھٹا سبق: خدا کی معرفت کا درس راستہ.....	۵۳.....
بیرونی راستہ.....	۵۳.....
لظم و ضبط اور عقل کاراستہ.....	۵۳.....
غور کجھے اور جواب دیجھے.....	۵۷.....
ساتواں سبق: نظام خلقت کے چند نمونے.....	۵۸.....
ملک بدن کی حکمرانی کا مرکز.....	۵۸.....
دماغ کا ایک عجیب و غریب حصہ.....	۶۰.....
دماغ کا ایک اور حیرت انگیز حصہ "حافظہ" ہے.....	۶۰.....
بے شعور طبیعت کیسے باشمعوچیزوں کی تخلیق کر سکتی ہے؟.....	۶۱.....
غور کجھے اور جواب دیجھے.....	۶۳.....
آٹھواں سبق: ایک چھوٹے سے پرندے میں ایک حیرت انگیز دنیا....	۶۳.....
چپگارڈ اور اس کی عجیب خلقت.....	۶۴.....
غور کجھے اور جواب دیجھے.....	۶۹.....
نوال سبق: حشرات اور پھولوں کی دوستی.....	۷۰.....
دو قدری اور جگری دوست.....	۷۲.....
توحید کا ایک درس.....	۷۳.....
غور کجھے اور جواب دیجھے.....	۷۵.....
دوساں سبق: نہایت چھوٹی مخلوقات کی دنیا.....	۷۶.....
ایم، توحید کا درس دیتے ہیں.....	۷۸.....
غور کجھے اور جواب دیجھے.....	۸۱.....
دسویں سبق کی ایک تکمیلی بحث.....	۸۲.....
خداؤند متعال کی عظیم الشان صفات.....	۸۲.....
صفات ثبوتیہ.....	۸۳.....
صفات سلبیہ.....	۸۵.....
غور کجھے اور جواب دیجھے.....	۸۷.....
عدل الہی کے دس سبق.....	۸۹.....

پہلا سبق: عدل کیا ہے؟.....	۹۰
عدل کی اہمیت.....	۹۰
عدالت کیا ہے؟.....	۹۲
مساوات اور عدالت میں فرق.....	۹۵
غور کجھ اور جواب دیجئے.....	۹۶
دوسرा سبق: عدل الٰی کے دلائل.....	۹۷
حسن و تحقیق عقلی.....	۹۷
ظلم کا سرچشمہ کیا ہے؟.....	۹۸
قرآن مجید اور عدل الٰی.....	۱۰۰
عدل و انصاف کی دعوت.....	۱۰۱
غور کجھ اور جواب دیجئے.....	۱۰۳
تیسرا سبق: آفات و بلیات کا فلسفہ (۱).....	۱۰۳
محدود معلومات اور حالات کے زیر اثر فیصلے.....	۱۰۵
ناخو شگوار اور انتماہ کرنے والے حوادث.....	۱۰۷
غور کجھ اور جواب دیجئے.....	۱۱۰
چوتھا سبق: آفات و بلیات کا فلسفہ (۲).....	۱۱۱
انسان مشکلات میں پرورش پاتا ہے.....	۱۱۱
مشکلات خدا کی طرف پلنے کا سبب ہیں.....	۱۱۳
غور کجھ اور جواب دیجئے.....	۱۱۶
پانچواں سبق: آفات و بلیات کا فلسفہ (۳).....	۱۱۷
مشکلات اور نشیب و فراز زندگی کو رو جھنتے ہیں.....	۱۱۷
خود ساختہ مشکلات.....	۱۱۹
غور کجھ اور جواب دیجئے.....	۱۲۳
چھٹا سبق: جبرا و اختیار کا مسئلہ.....	۱۲۳
جبرا کے عقیدہ کا سرچشمہ.....	۱۲۳
جبرا یوں کی غلط فہمی کی اصل وجہ.....	۱۲۶

مکتب جبر کے سماجی اور سیاسی اسباب.....	۱۲۷
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۱۳۰
ساتواں سبق: ارادہ و اختیار کی آزادی پر واضح ترین دلیل.....	۱۳۱
انسان کا ضمیر جبر کی نفی کرتا ہے.....	۱۳۱
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۱۳۶
آنھواں سبق: ”امر بین الامرين“ کیا ہے؟.....	۱۳۷
جبر کے مقابلہ میں ”عقیدہ تفویض“.....	۱۳۷
درمیانی مکتب.....	۱۳۸
دوسری مثال.....	۱۳۹
قرآن مجید اور جبر و اختیار کا مسئلہ.....	۱۴۱
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۱۴۲
نواں سبق: ہدایت و گمراہی خدا کے ہاتھ میں ہے.....	۱۴۵
ہدایت و گمراہی کی اقسام.....	۱۴۵
ایک اہم سوال.....	۱۴۶
کیا خدا کا ازالی علم گناہ کی علت ہے؟.....	۱۴۹
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۱۵۱
دوساں سبق: عدل الٰہی اور مسئلہ ”خلود“.....	۱۵۲
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۱۵۸
نبوٰت کے دس سبق.....	۱۵۹
پہلا سبق: رہبر ان الٰہی کی ضرورت.....	۱۶۰
ہمارے علم و دانش کی محدودیت.....	۱۶۰
تعلیم کے اعتبار سے احتیاج.....	۱۶۳
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۱۶۷
دوسرا سبق: قانون گزاری کے لئے امنیاء کی ضرورت.....	۱۶۸
بہترین قانون ساز کون ہے؟.....	۱۷۰
یہ شراکٹ کس میں جمع ہیں؟.....	۱۷۲

توحید و نبوت کے درمیان رابطہ.....	۱۷۳
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۱۷۶
تیسرا سبق: انہیاء کیوں مخصوص ہیں.....	۱۷۷
سہو و خطا سے پاک ہونا.....	۱۷۸
عصمت کا مرتبہ کیسے فضیلت کا سبب بن سکتا ہے؟.....	۱۸۰
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۱۸۲
چوتھا سبق: پیغمبر شناسی کا بہترین طریقہ.....	۱۸۲
چند و اسخ نمونے.....	۱۸۵
مجررات کو خرافات سے نہیں ملانا چاہئے.....	۱۸۶
مجزہ کا دوسرا خارق العادت چیزوں سے فرق.....	۱۸۷
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۱۹۰
پانچواں سبق: پیغمبر اسلام کا سب سے بڑا مجزہ.....	۱۹۱
لافقی مجزہ.....	۱۹۱
اس چیلنج کے مقابلہ میں مخالفین کا مجزہ.....	۱۹۳
ولید بن مغیرہ کا واقعہ.....	۱۹۵
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۱۹۹
چھٹا سبق: قرآن مجید کے اعجاز کی ایک جملک.....	۲۰۰
حرروف مقطعلات کیوں؟.....	۲۰۰
فصاحت و بلاعث.....	۲۰۱
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۲۰۵
ساتواں سبق: خداشناگی کے بارے میں قرآن کا طرز بیان....	۲۰۶
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۲۱۳
آٹھواں سبق: قرآن مجید اور جدید سائنسی اکتشافات.....	۲۱۵
قرآن مجید اور قوت جاذبہ کا قانون.....	۲۱۶
زمین کے اپنے اور سورج کے گرد گھونمنے کا اکتشاف...	۲۱۹
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۲۲۲

نواں سبق: پیغمبر اسلامؐ کی حقانیت پر ایک اور دلیل.....	۲۲۳
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۲۳۰
دسوال سبق: پیغمبر اسلامؐ کا خاتم الانبیاء ہونا.....	۲۳۱
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۲۳۰
امامت کے دس سبق.....	۲۳۱
پہلا سبق: امامت کی بحث کب سے شروع ہوئی؟.....	۲۳۲
کیا یہ بحث اختلاف پیدا کرنے والی ہے؟.....	۲۳۳
امامت کیا ہے؟.....	۲۳۶
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۲۳۸
دوسرा سبق: امام کے وجود کا فلسفہ.....	۲۳۹
اُنی رہبروں کے وجود کے ساتھ معنوی تکامل.....	۲۴۹
آسمانی ادیان کی حفاظت.....	۲۵۰
امت کی سیاسی و اجتماعی رہبری.....	۲۵۱
امتمام ججت کی ضرورت.....	۲۵۳
امام فیض اُنی کا عظیم وسیلہ ہے.....	۲۵۴
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۲۵۵
تیسرا سبق: امام کے خاص شرائط و صفات.....	۲۵۶
معصوم.....	۲۵۷
بھرپور علم.....	۲۵۸
شجاعت.....	۲۵۹
زہد و تقویٰ.....	۲۵۹
پرکشش اخلاق.....	۲۵۹
غور کیجئے اور جواب دیجئے.....	۲۶۱
چوتھا سبق: امام کا تعین کس کے ذمہ ہے؟.....	۲۶۲
کیا امت کو پیغمبر کا جائزین منتخب کرنے کا حق ہے؟.....	۲۶۳
کیا پیغمبر اسلامؐ نے اپنا جائزین مقرر نہیں فرمایا ہے؟.....	۲۶۵

اجماع اور شوریٰ.....	۲۶۷.....
علیٰ سب سے لاَق و افضل تھے.....	۲۶۹.....
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۲۷۰.....
پانچواں سبق: قرآن اور امامت.....	۲۷۱.....
قرآن مجید امامت کو خدا کی جانب سے جانتا ہے.....	۲۷۱.....
آیہ تبلیغ.....	۲۷۳.....
آیہ اطاعت اول والا مر.....	۲۷۶.....
آیہ ولایت.....	۲۷۷.....
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۲۸۰.....
چھٹا سبق: امامت، سنت نبی کی روشنی میں.....	۲۸۱.....
حدیث غدیر.....	۲۸۲.....
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۲۸۹.....
ساتواں سبق: ”حدیث منزلت“ اور ”حدیث یوم الدار“.....	۲۹۰.....
حدیث منزلت کا مفہوم.....	۲۹۳.....
حدیث یوم الدار.....	۲۹۳.....
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۲۹۶.....
آٹھواں سبق: حدیث ثقلین اور حدیث سفینہ.....	۲۹۷.....
حدیث ثقلین کے اسناد.....	۲۹۷.....
حدیث ثقلین کا مفہوم.....	۳۰۰.....
حدیث سفینہ.....	۳۰۲.....
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۰۳.....
نواں سبق: بارہ امام.....	۳۰۳.....
بارہ اماموں کے بارے میں روایات.....	۳۰۴.....
ان احادیث کا مفہوم.....	۳۰۶.....
نام نام ائمہ کی تعین.....	۳۰۹.....
جو شخص اپنے زمانے کے امام کو پہچانے بغیر مر جائے.....	۳۱۲.....

غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۱۳
دوساں سبق: حضرت مہدی (ع) بار ہویں امام اور دنیا کے مصلح اعظم	۳۱۵
تاریک شب کا خاتمہ.....	۳۱۵
فطرت اور مصلح اعظم کا ظہور.....	۳۱۷
عقلی دلائل.....	۳۲۰
قرآن مجید اور ظہور حضرت مہدی (ع).....	۳۲۲
احادیث میں حضرت مہدی کا ذکر.....	۳۲۳
اہل سنت کی احادیث.....	۳۲۵
شیعوں کی احادیث.....	۳۲۶
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۲۹
معاد کے دس سبق.....	۳۳۱
پہلا سبق: موت اختتم ہے یا آغاز؟	۳۳۲
اکثر لوگ موت سے ڈرتے ہیں، کیوں؟.....	۳۳۲
خوف کا اصلی سبب.....	۳۳۳
موت کو فنا سمجھنا.....	۳۳۳
سیاہ اعمال نامے.....	۳۳۴
دو مختلف نظریے.....	۳۳۵
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۳۸
دوسرा سبق: معاد زندگی کو معنی بخشتی ہے.....	۳۳۹
عقیدہ معاد کا انسان کی تربیت میں اہم کردار.....	۳۴۱
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۴۵
تیسرا سبق: قیامت کی عدالت کا نمونہ خود آپ کے وجود میں ہے.....	۳۴۶
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۵۲
چوتھا سبق: معاد، فطرت کی جلوہ گاہ میں.....	۳۵۳
بقاء کا عشق.....	۳۵۴
گزشتہ اقوام میں قیامت کا عقیدہ.....	۳۵۴

غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۵۸.....
پانچواں سبق: قیامت انصاف کی ترازو میں.....	۳۵۹.....
اختیار اور رادہ کی آزادی.....	۳۶۰.....
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۶۲.....
چھٹا سبق: قیامت کا اسی دنیا میں مشاہدہ.....	۳۶۵.....
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۷۱.....
ساتواں سبق: معاد اور تخلیق کا فلسفہ.....	۳۷۲.....
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۷۷.....
آٹھواں سبق: روح کی بقاء قیامت کی ایک علامت.....	۳۷۸.....
ایک وسیع کائنات ایک چھوٹی جگہ میں نہیں سما سکتی۔.....	۳۸۰.....
بیرونی دنیا میں روح کے انعکاس کی خصوصیت.....	۳۸۱.....
روح کے حقیقی اور مستقل ہونے پر تحریر ہاتی دلائل.....	۳۸۲.....
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۸۶.....
نواں سبق: جسمانی اور روحانی معاد.....	۳۸۷.....
جسمانی معاد پر قرآنی شواہد.....	۳۸۸.....
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۳۹۳.....

دوساں سبق: جت، جسم اور تجسس اعمال.....	۳۹۵.....
اعمال کا مجسم ہونا.....	۳۹۹.....
غور کچھ اور جواب دیجئے.....	۴۰۳.....

معرفت خدا

کے

دس سبق

: پہلا سبق

خدا کی تلاش

ا۔ کائنات سے واقفیت کا شوق  
خلقت کائنات کے بارے میں آگاہی اور آشنائی حاصل کرنے کا شوق ہم سب میں پایا جاتا ہے۔

یقیناً ہم سب جانتا چاہتے ہیں:

خوبصورت ستاروں سے چمکتا ہوا یہ بلند والا آسمان، دلکش مناظر سے بھری یہ وسیع زمین، یہ رنگ برنگ مخلوقات، خوبصورت پرندے، طرح طرح کی مچھلیاں، سمدر اور پہاڑ، کلیاں اور پھول، سربہ فلک قسم کے درخت اور... کیا خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا یہ عجیب و غریب نقشے کسی ماہر، قادر و غالب نقاش کے ہاتھوں کھینچے گئے ہیں؟...

اس کے علاوہ ہماری زندگی میں ہم سب کے لئے جواب اپنی سوالات پیدا ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں:

ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں پر ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟

اگر ہم ان مذکورہ تینوں سوالات کے جواب جانیں تو کتنے خوش قسمت ہوں گے؟ یعنی ہم جانیں کہ ہماری زندگی کا آغاز کہاں سے ہوا ہے اور سرانجام کہاں جائیں گے؟ اور اس وقت ہماری کیا زندگی داری ہے؟

ہمارا ضمیر ہم سے کہتا ہے: مذکورہ سوالات کے جواب حاصل کرنے تک آرام سے نہ بیٹھنا۔

کبھی کوئی شخص ٹریف حادثہ میں زخمی ہو کر بے ہوش ہو جاتا ہے اور معالجہ کے لئے اسے ہسپتال لے جاتے ہیں۔ جب اس کی حالت قدرے بہتر ہوتی ہے اور وہ ہوش میں آتا ہے تو اپنے ارد گرد موجود افراد سے اس کا پہلا سوال یہ ہوتا ہے: یہ کون سی جگہ ہے؟ مجھے کیوں یہاں لا یا گیا ہے؟ میں کب یہاں سے جاؤں گا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایسے سوالات کے مقابلہ میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا ہے۔

اس لئے جو چیز ہمیں سب سے پہلے خدا کی تلاش اور خالق کائنات کی معرفت حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے، وہ ہماری تشنه اور متلاشی روح ہے۔

۲۔ شکر گزاری کا احساس۔

فرض کیجئے آپ کی ایک محترم مہمان کی حیثیت سے دعوت کی گئی ہے اور آپ کی مہمان نوازی اور آرام و آسائش کے تمام وسائل مہیا کئے گئے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ دعوت آپ کے بڑے بھائی کے توسط سے انجام پائی ہے اور اپنے اسی بھائی کے ہمراہ دعوت پر گئے ہیں اور وہ اپنے میز بان کو اچھی طرح سے نہیں پہچانتے، اس لئے اس دعوت پر بچنتے ہی آپ سب سے پہلے اپنے میز بان کو پہچان کر اس کا شکر یہ بجالانے کی کوشش کریں گے۔

ہم بھی جب خالق کائنات کے بچائے ہوئے خلقت کے اس وسیع دستِ خوان پر نظر ڈالتے ہیں اور بینائی والی آنکھیں، سننے کے کان، عقل و ہوش، مختلف جسمانی اور نفسیاتی توانائیاں، زندگی کے مختلف وسائل اور پاپک و پاکیزہ رزق چیزیں گوناگون نعمتوں کو اس وسیع دستِ خوان پر دیکھتے ہیں تو بے ساختہ اس فکر میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ تمام نعمتوں کا عطا کرنے والے کو پہچان لیں اور اگرچہ وہ ہمارے شکر یہ کا محتاج بھی نہ ہو، ہمیں اس کا شکر یہ بجالانا چاہئے اور جب تک یہ کام انجام نہ دیں، ہم بے چینی اور کمی کا احساس کرتے ہیں، لہذا یہ ایک اور دلیل ہے جو ہمیں خدا کو پہچاننے کی طرف ترغیب دیتی ہے۔

۳۔ خدا کی معرفت سے ہمارے نفع و نقصان کا تعلق۔

فرض کیجئے اپنے سفر کے راست پر آپ ایک چورا ہے پر پہنچے، وہاں پر شور و غل برپا ہے، سب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس چورا ہے پر نہ رکنے، یہاں بڑے خطرات ہیں۔ لیکن ہر ایک ہماری الگ الگ راستے کی طرف را ہنمائی کرتا ہے۔ ایک کہتا ہے: بہترین راستہ یہ ہے کہ مشرق کی طرف چلے جائیں، دوسرا مغرب کی طرف مطمئن ترین راستہ بتاتا ہے اور تیسرا ہمیں ان دور استوں کے تیجے والے راستہ کی طرف را ہنمائی کرتا ہے، اور کہتا ہے خطرہ سے بچنے کا اور منزل نیزاں و امان اور سعادت و خوش بختی کی جگہ تک پہنچنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔

کیا ہم یہاں پر غور و فکر اور تحقیق کئے بغیر ان راستوں میں سے کسی ایک راستہ کا انتخاب کریں گے؟ یا ہماری عقل ہمیں یہ حکم دے گی کہ وہیں پر رکے رہیں اور کسی راستہ کا انتخاب نہ کریں؟ قطعاً ایسا نہیں ہے۔

بلکہ عقل ہمیں حکم دیتی ہے کہ اس حالت میں جتنی جلد ممکن ہو تحقیق کریں اور ان افراد کی تجویزوں میں سے ہر ایک پر غور و فکر کے بعد جس کسی کے بارے میں صحیح اور سچ ہونے کی نشانیاں اور اطمینان بخش دلائل موجود ہوں، اسے قبول کریں اور اطمینان کے ساتھ اس راہ کو منتخب کر کے آگے بڑھیں۔ اس دینوں زندگی میں بھی ہماری یہی حالت ہے۔ مختلف مذاہب اور مکاتب فکر میں سے ہر ایک ہمیں اپنی طرف دعوت دیتا ہے۔ لیکن چونکہ ہماری تقدیر، ہماری خوشبختی و بد بختی، ہماری ترقی و تنزل کا دار و مدار کہترین راستے کی تحقیق اور اس کے انتخاب کرنے پر ہے، اس لئے ہم مجبور ہیں کہ اس سلسلہ میں غور و فکر کریں اور جو راستہ ہماری ترقی و تکامل کے موجب ہوا سے اپنے لئے چن لیں اور جو ہماری نابودی، بد بختی اور بر بادی کا سبب ہوا سے پرہیز کریں۔

یہ بھی ہمارے لئے خالق کائنات کے بارے میں مطالعہ اور تحقیق کرنے کی طرف دعوت کرنے کی ایک اور دلیل ہے۔  
قرآن مجید فرماتا ہے:

(فَبَشِّرْ عِبَادَ اللَّهِينَ يَسْمَعُونَ الْقُولَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ) (سورة زمر د آیہ ۱۸)

”میرے ان بندوں کو بشارت دیجئے، جو مختلف بانوں کو سنتے ہیں اور ان میں جو بات اچھی ہوتی ہے اسی کا اتباع کرتے ہیں۔“

غور کیجئے اور جواب دیجئے:

- ۱۔ کیا آپ نے خدا کی معرفت کے سلسلہ میں جو کچھ آج تک اپنے ماں باپ سے سنائے ہے، اس کے علاوہ اس بارے میں خود بھی سنبھیلی سے غور کیا ہے؟
- ۲۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ خدا کی تلاش اور خدا کی معرفت میں کیا فرق ہے؟
- ۳۔ کیا آپ نے خداوند متعال سے راز و نیاز کے دوران کبھی ایک عین روحانی لذت کا احساس کیا ہے؟

## دوسرا سبق

ہماری زندگی میں خدا کے وجود کی نشانیاں

### ۱۔ خدا کی معرفت اور علوم کی ترقی

فرض کیجئے کہ آپ کا ایک دوست سفر سے لوٹا ہے اور آپ کے لئے تخفہ کے طور پر ایک کتاب لایا ہے اور اس کتاب کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ ایک بہترین کتاب ہے کیونکہ اس کا مصنف ایک غیر معمولی فناخت کامالک، دانشور، آگاہ، ماہر اور اپنے فن میں ہر مجاز سے انوکھا اور استاد ہے۔

آپ اس کتاب کا ہر گز سری مطالعہ نہیں کریں گے بلکہ اس کے بر عکس اس کے تمام جملوں حتیٰ اس کے لفظ لفظ پر غور و خوض کریں گے اور اگر اس کے کسی جملہ کو نہ سمجھے تو گھنٹوں بلکہ شاید مسلسل کئی دنوں تک فرصت پانے پر اس کے بارے میں سمجھی و کوشش کریں گے تاکہ اس کا معنی و مفہوم آپ کے لئے واضح ہو جائے، کیونکہ اس کا مصنف ایک عام انسان نہیں ہے بلکہ ایک ایسا عظیم دانشور ہے جو سوچے سمجھے بغیر ایک لفظ بھی نہیں لکھتا ہے۔ لیکن اگر اس کے بر عکس آپ سے کہا جائے کہ (اگرچہ ممکن ہے یہ کتاب بظاہر خوبصورت ہو، لیکن) اس کا مصنف ایک کم علم شخص ہے اور کسی قسم کی علمی صلاحیت نہیں رکھتا ہے اور اس کے کام میں کوئی نظم و ضبط نہیں ہے!

واضح ہے کہ آپ اس قسم کی کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے اور جہاں پر بھی کوئی ناقابل فہم مطلب نظر آئے گا اسے مصنف کی کم علمی کا نتیجہ تصور کریں گے اور سوچیں گے کہ اس پر وقت صرف کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے!

کائنات کی مثال بھی ایک عظیم کتاب کے مانند ہے کہ اس میں موجود ہر مخلوق اس کا ایک لفظی جملہ ہے۔ ایک خدا شناس شخص کی نظر میں کائنات کے تمام ذریعات قابل غور ہیں۔ ایک ہایمان انسان خدا پرستی کے نور کے پرتو میں ایک خاص تفکر و تدبیر کے ساتھ خلقت کے اسرار کا مطالعہ کرتا ہے (اور یہی موضوع انسان کے علم و دانش کی ترقی میں مدد و گارثابت ہوتا ہے) کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کائنات کا خالق، بے انہتا علم و قدرت رکھتا ہے، اور اس کے تمام کام حکمت و فلسفہ کی بنیاد پر ہیں، اس لئے وہ اور باریک بنی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے، گہری تحقیق کرتا ہے تاکہ اس کے اسرار کو بہتر صورت میں درکر کرے۔

لیکن ایک ماہ پرست انسان خلقت کے اسرار کا گہر امطالعہ کرنے کا شوق ہی نہیں رکھتا ہے، کیونکہ وہ بے شعور طبیعت کو ان کا خالق جانتا ہے۔ اگر ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض ادی دانشور سائنسی ایجادات انجام دیتے ہیں، یہ اس لئے ہے کہ وہ غالباً خدا کو قبول کرتے ہیں، صرف اس کا نام طبیعت رکھتے ہیں، کیونکہ وہ طبیعت کے کام کے سلسلہ میں ”نظم“، ”حساب“ اور ”نظم“ کے قائل ہیں۔ مختصر یہ کہ خدا پرستی علم و دانش کی ترقی کا وسیلہ ہے۔

### ۲۔ خدا کی معرفت اور تلاش و امید

جب انسان اپنی زندگی میں سخت اور پیچیدہ حوادث سے دوچار ہوتا ہے اور بظاہر اس پر ہر طرف سے امید کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور مشکلات کے مقابلہ میں کمزوری، ناقوانی اور تہائی کا احساس کرتا ہے تو اس وقت خدا پر ہایمان اس کی مدد کرتا ہے اور اسے تو انہی بخششا ہے۔

جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی اپنے آپ کو تہا اور ناتواں نہیں پاتے، نامید نہیں ہوتے، کمزوری اور ناتوانی کا احساس نہیں کرتے، کیونکہ خدائی طاقت تمام مشکلات سے بالاتر ہے اور خدا کے سامنے تمام چیزیں آسان ہیں۔

ایسے لوگ پروردگار عالم کی مہربانی، حمایت اور مدد کی امید کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں اور اپنی پوری طاقت کو بروئے کار لاتے ہیں اور عشق و امید کے ساتھ سعی و کوشش کو جاری رکھتے ہیں اور مشکلات پر غلبہ پاتے ہیں۔

جی ہاں! خدا پر ایمان انسانوں کے لئے ایک بڑا شہر ہے۔

خدا پر ایمان استقامت اور پانڈاری کا سبب ہے۔

خدا پر ایمان، دلوں میں امید کی کرن کو ہمیشہ باقی رکھتا ہے۔ اسی لئے با ایمان افراد کبھی خود کشی کا اقدام نہیں کرتے ہیں کیونکہ خود کشی کا سرچشمہ کامل نا امیدی اور ناکامی کا احساس ہے، لیکن با ایمان افراد نہ ہی نامید ہوتے ہیں اور نہ ہی ناکامی کا احساس کرتے ہیں۔

۳۔ خدا کی معرفت اور ذمہ داری کا احساس

ہم ایسے ڈاکٹروں کو جانتے ہیں کہ جب کوئی تنگ دست بیماران کے پاس آتا ہے تو نہ صرف وہ اس سے فیس نہیں لیتے بلکہ اس کی دوائی کے پیے بھی اپنے جیب سے دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اپنے بیمار کے بارے میں خطرہ کا احساس کرتے ہیں تو اس کی جھونپڑی میں رات بھراں کے سرہانے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ خدا پرست اور با ایمان افراد ہیں۔

لیکن ہم ایسے ڈاکٹروں کو بھی جانتے ہیں کہ پیے لئے بغیر بیمار کے لئے کسی قسم کا اقدام نہیں کرتے ہیں، کیونکہ یہ قوی ایمان نہیں رکھتے۔

ایک با ایمان انسان جس عہد پر بھی فائز ہو، ذمہ داری کا احساس کرتا ہے، وہ فرض شناس ہوتا ہے، نیک اور بخشش والا ہوتا ہے، وہ ہمیشہ اپنے اندر ایک معنوی پلیس کو حاضر پاتا ہے جو اس کے اعمال کی مگر انی کرتا ہے۔

لیکن بے ایمان افراد خود خواہ، خود غرض اور خطرناک ہوتے ہیں اور اپنے لئے بھی ذمہ داری کے قائل نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ظلم و ستم اور دوسروں کی حق تلفی کرنا آسان ہوتا ہے اور نیک کام انجام دینے کے لئے حاضر نہیں ہوتے ہیں۔

۴۔ خدا کی معرفت اور سکون قلب

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ موجودہ زمانہ میں نفسیاتی اور روحی بیماریاں دوسرے زمانوں کی نسبت زیادہ ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ ان بیماریوں کا ایک سبب احساس پریشانی ہے، مستقبل کے حادث کی پریشانی، موت کی پریشانی، جنگ کی پریشانی اور فقر و ناکامی کی پریشانی۔ لیکن اس کے بعد وہ کہتے ہیں: انسان کی روح سے پریشانیوں اور اضطرابوں کو دور کرنے والی چیزوں میں سے ایک خدا پر ایمان ہے۔ کیونکہ جب بھی پریشانی کے عوامل و اسباب اس کی روح پر اثر انداز ہونا چاہتے ہیں خدا پر ایمان انھیں بچھ پھٹادیتا ہے۔

خدا جو مہربان ہے، خدا جو رزق دیتا ہے، خدا جو اپنے بندوں کے حالات سے آگاہ ہے اور اس کے بندے جب بھی اس کی طرف رجھ کرتے ہیں، وہ ان کی مدد کرتا ہے اور مشکلات سے انھیں نجات بخشتا ہے۔

اسی لئے حقیقی مومنین ہمیشہ سکون احساس کرتے ہیں اور ان کی روح میں کبھی اضطراب نہیں ہوتا ہے اور چونکہ ان کا کام خدا کے لئے ہوتا ہے اس لئے اگر کبھی کوئی نقصان بھی اٹھاتے ہیں تو اسی سے تلافی چاہتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ کے دوران بھی ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

(الَّذِينَ آمَنُوا لَمْ يَلِبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ وَلَكُمْ لِحُمَّ الْأَمْنِ) (سورة انعام، ۸۲)

”جو لوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلوہ نہیں کیا اور انھیں کے لئے امن و سکون ہے۔“

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ کیا آپ کو گزشتہ لوگوں کی کوئی ایسی داستان یاد ہے جو مذکورہ ایمان و آثار کی وضاحت کرے؟

۲۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ خدا پر ایمان رکھنے کا دم بھرنے والے بعض افراد کیوں اخلاقی برائیوں سے آلوہ ہوتے ہیں اور ان میں مذکورہ چار آثار نہیں پائے جاتے ہیں؟

## تیسرا سبق

خدا کی معرفت کے دو اطمینان بخش راستے

معرفت خدا کے بارے میں زمانہ قدیم سے آج تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس موضوع پر دانشوروں اور غیر دانشوروں میں کافی بحث و گفتگو ہوتی رہی ہے۔

اس حقیقت کو پانے کے لئے ہر ایک نے ایک راستہ کا اختیار کیا ہے۔ لیکن تمام راستوں میں سے بہترین راستے جو ہمیں خالق کائنات تک جلدی پہنچاسکے ہیں، دو راستے ہیں:

الف۔ اندر و فی راستہ (نزدیک ترین راستہ)

ب۔ بیرونی راستہ ( واضح ترین راستہ )

پہلے طریقہ میں ہم اپنے وجود کی گہرائیوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں تاکہ توحید کی آواز کو اپنی روح کے اندر سن لیں۔

دوسرے طریقہ میں ہم و سچ کائنات پر ایک نظر ڈلتے ہیں اور تمام مخلوقات کی پیشانی پر اور ہر ذرہ کے اندر خداوند متعال کی نشانیاں پاتے ہیں۔ ان دو طریقوں میں سے ہر ایک کے بارے میں طویل بحثیں کی گئی ہیں۔ لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ ایک مختصر بحث کے ذریعہ ان دو طریقوں کو ایک اجمالی تحقیق کے ساتھ بیان کریں۔

الف۔ اندر و فی راستہ

مندرجہ ذیل چند موضوعات قبل غور ہیں:

۱۔ دانشور کہتے ہیں: اگر کسی بھی قوم و نسل سے متعلق ایک انسان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اسے کسی خاص قسم کی تعلیم و تربیت نہ دی جائے، حتی خدا پرستی اور مادیت کی گفتگو سے بھی بے خبر کھا جائے تب بھی وہ خود بخود ایک ایسی قوی طاقت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو مادی دنیا سے بالاتر ہے اور پوری کائنات پر حکمران ہے۔

وہ اپنے ذل اور ضمیر کی عین گہرائیوں میں ایک طفیل، محبت آمیز، اور متقن و محکم آواز کا احساس کرتا ہے جو اسے علم و قدرت کے ایک عظیم مبداء کی طرف بلاتی ہے، جسے ہم خدا کہتے ہیں۔

یہ بشر کی وہی پاک اور بے لاگ فطری کی آواز ہے۔

۲۔ ممکن ہے مادی دنیا اور روزمرہ زندگی کا شور و غل اور اس کی چمک دمک اس کو اپنی طرف مشغول کرے اور وہ عارضی طور پر اس آواز کو سنبھلے گئے جائے، لیکن جب وہ اپنے آپ کو مشکلات اور مصیبتوں کے مقابلہ میں پاتا ہے، جب خطرناک طبیعی حادث اس پر حملہ آور ہوتے ہیں جیسے سیلاہ، زلزلہ، طوفان اور ایک نامناسب موسم کے سبب ہوائی جہاز میں رونما ہونے والے اضطرابی حالات سے دوچار ہوتا ہے، اس وقت وہ تمام مادی وسائل سے مایوس ہو جاتا ہے اور اپنے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں پاتا ہے تو یہ آواز اس کی روح کے اندر ابھرتی ہے، وہ احساس کرتا ہے کہ اس کے وجود کے اندر سے ایک طاقت اسے اپنی طرف بلاتی ہے، ایک ایسی طاقت جو تمام طاقتوں سے برتر ہے، ایک پراسرار طاقت جس کے سامنے تمام مشکلات سہل اور آسان ہیں۔

آپ بہت کم ایسے لوگوں کو پائیں گے جو اپنی زندگی کے مشکل ترین حادث میں اس قسم کی حالت پیدا نہ کریں اور بے اختیار خدا کو یاد نہ کریں۔ یہی بات

ہمیں بتاتی ہے کہ ہم کتنا اس کے نزدیک ہیں اور وہ کس قدر ہمارے قریب ہے، وہ ہماری روح و جان میں موجود ہے۔

البته فطری آواز ہمیشہ انسان کی روح میں موجود ہے لیکن مذکورہ لحظات میں یہ آواز زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔

۳۔ تاریخ ہمیں اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ ایسے صاحبان اقتدار جو اپنے جاہ و جلال اور آرام و آسائش کے لمحات میں خدا کا نام تک لینے سے انکار کرتے تھے، جب اپنی قدرت کی بنیادوں کو متزل ہوتے اور اپنی ہستی کے محلوں کو گرتے دیکھتے تھے تو اس عظیم مبدأ (خدا) کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور فطری آواز کو واضح طور پر سنتے تھے۔

تاریخ ہمیں ہے: جب فرعون نے اپنے آپ کو پر تلاطم لہروں کی لپیٹ میں پایا اور اس نے مشاہدہ کیا کہ جو پانی اس کے ملک کی آبادی اور زندگی کا سبب اور اس کی تمام مادی طاقت کا سرچشمہ تھا، اس وقت اس کے لئے موت کا حکم جاری کر رہا ہے اور وہ چند چھوٹی لہروں کے مقابلہ میں بے بس ہو کر رہ گیا ہے اور ہر طرف سے اس پر نامیدی چھائی ہوئی ہے، تو اس نے فریاد بلند کی: ”میں اس وقت اعتراض کرتا ہوں کہ موئی کے خدا کے علاوہ کوئی معبد نہیں ہے۔“ حقیقت میں یہ فریاد اس کی فطرت اور روح کی گہرائیوں سے بلند ہوئی تھی نہ صرف فرعون بلکہ وہ تمام لوگ جو ایسے حالات سے دوچار ہو جاتے ہیں، اس آواز کو واضح طور پر سنتے ہیں۔

۴۔ خود آپ بھی اگر اپنے دل کی گہرائیوں پر توجہ کریں گے تو ضرور تائید کریں گے کہ وہاں پر ایک نور چمکتا ہے جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہے۔ شاید زندگی میں آپ کو کئی بار ناقابل برداشت حoadث اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑے اہو اور تمام مادی و سائل ان مشکلات کو دور کرنے میں ناکام ہو گئے ہوں، ان لمحات کے دوران آپ کے ذہن یہیں یہ حقیقت ضرور اجاگر ہوئی ہو گی کہ اس کائنات میں ایک بڑی اور قدر تمند طاقت موجود ہے جو اس مشکل کو آسانی کے ساتھ حل کر سکتی ہے۔

ان لمحات میں آپ کی امید پر ورد گار کی عشق سے ممزوج ہو کر آپ کی روح و جان کو اپنی آغوش میں لیتی ہے اور یاں ونا میدی کو آپ کے دل سے دور کر دیتی ہے۔

جی ہاں! یہ نزدیک ترین راستہ ہے کہ ہر شخص اپنی روح کے اندر پرورد گار عالم اور خالق کا کنات کو پاسکتا ہے۔

ایک سوال

ممکن ہے آپ میں سے بعض افراد یہ سوال کریں کہ کیا یہ احتمال نہیں ہے کہ ہم ماحول اور اپنے والدین سے حاصل کی گئی تعلیمات کے زیر اثر حساس موقع پر ایسا سوچتے ہیں؟ اور خدا کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلاتے ہیں؟

ہم اس سوال کے بارے میں آپ کو حق بجانب جانتے ہیں اور ہمارے پاس اس کا ایک دلچسپ جواب ہے، جسے ہم آئندہ سبق میں بیان کریں گے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

(فَإِذَا كُبُونِي اللَّهُكَ دُعَوَ اللَّهُمَّ مَخَصِّينَ لِهِ الدِّينِ فَلَمَّا نَجَحُوا إِلَى الْبَرِّ إِذَا حَمِّمْ يَثْرَكُونَ) (سورة عنكبوت، ۲۵)

”پھر جب یہ لوگ کشتوں میں سوار ہوتے ہیں تو ایمان و عقیدہ کے پورے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں پھر جب وہ نجات دے کر خشکی تک پہنچ دیتا ہے تو فوراً اشک انتیار کر لیتے ہیں۔“

## غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ کو شش کر کے مذکورہ آئیہ کریمہ کو آیت اور سورہ کے نمبر اس کے ترجمہ کے ساتھ لفظ بے لفظ یاد کیجئے اور بتدر تجزیہ زبان قرآن سے آگاہی حاصل کیجئے۔
- ۲۔ کیا آپ کو کبھی کوئی ایسا مشکل حادثہ پیش آیا ہے کہ آپ ہر طرف سے مایوس ہو چکے ہوں اور صرف پورا دگار کے لطف کی امید باقی رہی ہو؟ (ایک مختصر مقالہ یا تقریر کے ذریعہ اس کو بیان کیجئے)۔
- ۳۔ اس راستہ کو ہم نے کیوں نزد یک ترین راستہ کہا ہے؟

## چو تھا سبق

ایک اہم سوال کا جواب

سوال

گرشنہ سبق میں ہم یہاں تک پہنچتے تھے کہ ہم توحید اور خدا پرستی کی آواز کو اپنی روح کے اندر سے سنتے ہیں، خاص کر مشکلات اور مصیبتوں کے وقت یہ آواز قوی تر ہو جاتی ہے اور ہم بے ساختہ طور پر خدا کو یاد کر کے اس کی لامدد و قدرت اور لطف و محبت سے مدد مانگتے ہیں۔

یہاں پر ممکن ہے یہ سوال پیش کیا جائے کہ یہ اندر ورنی آواز، جسے ہم فطرت کی آواز کہتے ہیں، ان تبلیغات کا نتیجہ ہو جو معاشرہ کے ماحول، مکتب و مدرسہ اور ماں باپ سے ہم سنتے ہیں اور یہ ہمارے لئے ایک قسم کی عادت بن گئی ہے۔

جواب

اس اعتراض کا جواب ایک مختصر سے مقدمہ کے ذریعہ واضح ہو جاتا ہے۔

عادتیں اور سُم و رواج، متغیر اور ناپائیدار چیزیں ہیں۔ یعنی ہم کسی عادت اور سُم و رواج کو پیدا نہیں کر سکتے ہیں جو پوری تاریخ بشر کے دوران تمام اقوام میں یکساں صورت میں باقی رہے ہوں۔ جو مسائل آج عادت اور سُم و رواج کے طور پر رونما ہوتے ہیں، ممکن ہے کل بدلتیں۔ اسی وجہ سے ممکن ہے ایک قوم کے سُم و رواج اور عادات دوسری قوموں میں نہ پائے جائیں۔

اس لئے اگر ہم مشاہدہ کریں کہ ایک چیز تمام قوموں اور ملتوں کے درمیان ہر زمان و مکان میں بلا استثناء موجود ہے تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ اس کی ایک فطری بنیاد ہے جو انسان کی روح و جان کی ساخت اور بناؤٹ میں قرار پائی ہے۔

مثال کے طور پر ایک ماں کی اپنے فرزند کی نسبت محبت کو کسی تلقین، تبلیغ عادت و سُم و رواج کا نتیجہ قطعاً نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ ہم کسی قوم و ملت اور کسی زمان و مکان میں نہیں پاتے ہیں کہ ایک ماں اپنی اولاد سے محبت نہیں کرتی ہو۔

البتہ ممکن ہے ایک ماں نفسیاتی بیماری کی وجہ سے اپنے فرزند کو نابود کر دے یا کوئی باپ جاہلیت کے زمانہ میں غلط اور خرافی تفکر کی وجہ سے اپنی بیٹی کو زندہ دفن کر دے، لیکن یہ انتہائی شاذ و نادر اور استثنائی موقع ہیں، جو جلدی ہی ختم ہو کر اپنی اصلی حالات (یعنی فرزند سے محبت) پر لوٹ آتے ہیں۔

ذکر کردہ تمہید کے پیش نظر ہم آج کے اور ماضی کے انسانوں کی خدا پرستی کے مسئلہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

(چونکہ یہ سبق قدرے پیچیدہ ہے اس لئے اس پر زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے)

۱۔ عمرانیات کے ماہرین اور بڑے مورخین کی گواہی کے مطابق ہم کسی ایسے زمانے کو نہیں پاتے ہیں جس میں مذہب اور مذہبی ایمان لوگوں میں موجود نہ رہا ہو بلکہ ہر عصر اور ہر زمانے میں دنیا میں ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں مذہب موجود تھا اور یہ بذات خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خدا پرستی کا سرچشمہ انسان کی روح و فطرت کی گہرائیوں میں موجود ہے نہ یہ کہ عادات، رسم و رواج اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ عادات، رسم

ورواج اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہوتا تو اس صورت میں اسے عام اور لافانی نہیں ہونا چاہئے تھا۔

یہاں تک کہ ایسے آنار و قرآن بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ما قبل تاریخ میں زندگی بسر کرنے والے لوگ بھی ایک فلم کے مذہب کے قائل تھے (ما قبل تاریخ کا زمانہ اس زمانہ کو کہتے ہیں کہ ابھی لکھائی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور انسان اپنی یادگار کے طور پر تحریر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

البتہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ چونکہ ابتدائی لوگ خدا کو ایک مافوق طبیعی وجود کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتے تھے اس لئے اسے مادی مخلوقت کے درمیان تلاش کرتے تھے اور اپنے لئے مادی مخلوقات سے بتاتے تھے۔ لیکن انسان نے عقل و فکر کی ترقی کے ساتھ رفتہ رفتہ حق کو پہچان لیا اور مادی مخلوقات کے بنائے ہوئے بتوں کو چھوڑ کر طبیعی کائنات کے ماوراء خدا کی لا محود قدرت سے آگاہ ہوا۔

۲۔ بعض ماہرین نفسیات نے صراحتاً گہا ہے کہ انسان کی روح کے چار پہلو یا چار اصلی حس پائے جاتے ہیں:

ا۔ ”دانائی کی حس“: یہ حس انسان کو علم و دانش حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے اور اس کی روح کو علم حاصل کرنے کا شوق دلاتی ہے، خواہ یہ علم اس کے لئے مادی فائدہ رکھتا ہو یانہ ہو۔

ب۔ ”بجلائی کی حس“: یہ حس عالم پریشیت میں اخلاقی اور انسانی مسائل کا سرچشمہ ہے۔

ج۔ ”زیبائی کی حس“: یہ حس، حقیقی معنی میں شعر، ادبیات اور فن و ہنر کا سرچشمہ ہے۔

د۔ ”مزہبی حس“: یہ حس، انسان کو معرفت خدا اور اس کے فرمان کی اطاعت کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی حس انسانی روح کی ایک بنیادی اور اصلی حس ہے۔ یعنی یہ حس نہ کبھی اس سے جدا تھی اور نہ کبھی جدا ہو گی۔

۳۔ آئندہ بخشوں میں ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اکثر مادہ پرست اور ملکرین خدا نے بھی ایک طرح سے خدا کے وجود کا اعتراض کیا ہے، اگرچہ وہ لوگ خدا کے نام لینے سے پرہیز کرتے ہیں اور اسے فطرت یاد و سرے نام سے پکارتے ہیں، لیکن اس فطرت کے لئے ایسی صفتیں کے قائل ہوتے ہیں کہ جو خدا کی صفات کے مشابہ ہیں۔

مثالاً کہتے ہیں: فطرت نے اگر انسان کو دو گردے دئے ہیں، یا اس لئے ہے کہ اسے معلوم تھا، ممکن ہے ان دو گردوں میں سے ایک خراب ہو جائے تو دوسرا گردہ اس کی زندگی کو جاری رکھ سکے، وہ ایسی تعبیرات بیان کرتے ہیں۔ کیا یہ بات ایک بے شعور فطرت کے ساتھ تناسب ہے؟ یا یہ کہ یہ ایک ایسے خداوند متعال کی طرف اشارہ ہے جو لا محدود علم و قدرت کا مالک ہے، اگرچہ انہوں نے اس کا نام فطرت رکھا ہے۔

بحث کا نتیجہ: اس بحث میں جو کچھ ہم نے بیان کیا، اس سے یہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں:

خدا کی محبت ہماری روح میں ہمیشہ موجود تھی اور ہو گی۔

خدا کا ایمان ایک ایسا ابدی شعلہ ہے جو ہمارے قلب و روح کو گرم کرتا ہے۔

خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ہم مجبور ہیں ہیں کہ طولانی راستے طے کریں، ہمیں اپنے وجود کی گہرائیوں میں نظر ڈالنی چاہئے، خدا پر ایمان کو ہم وہاں پر پائیں گے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

(وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ جَبَلِ الْوَرِيدِ) (سورة ق، ۱۶)

”اور ہم اس سے رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔“

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ عادت کی چند مثالیں اور فطرت کی چند مثالیں بیان کیجئے۔

۲۔ نادان لوگ کیوں بت پرستی کے پیچے جاتے تھے؟

۳۔ ماہہ پرست خدا کو کیوں ”فطرت“ کے نام سے یاد کرتے ہیں؟

## پانچواں سبق:

ایک سچا واقع

ہم نے میان کیا کہ زبان سے خدا کا انکار کرنے والے بھی اپنی روح کی گہرائیوں میں خدا کے وجود کا ایماب رکھتے ہیں۔  
بیشک کامیاب بیا۔ خاص کرم ظرف لوگوں کے لئے۔ غرور پیدا کرتی ہیں اور یہی غرور، فراموشی کا سبب بنتا ہے، یہاں تک کہ کبھی انسان اپنی فطرت کو بھی بھول جاتا ہے۔ لیکن جب حادث کے طوفان اس کی زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں اور مشکلات کی تندو تیز آندھیاں ہر طرف سے اس پر حملے کرتی ہیں، تو اس کی آنکھوں کے سامنے سے غرور و تکبر کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور توحید و معرفت خدا کی فطرت نمایاں ہو جاتی ہے۔

تاریخ بشر اس قسم کے افراد کے بہت سے نمونے پیش کرتی ہے، مندرجہ ذیل واقعہ ان میں سے ایک ہے:

ایک شخص اپنے زمانے کا مقتدر اور قوی وزیر تھا، اکثر عبدوں کو اپنے قبضہ میں لے چکا تھا، کوئی اس کی مخالفت کی جرئت نہیں کرتا تھا۔ ایک دن یہ وزیر ایک ایسی مجلس میں داخل ہوا جہاں پر دینی علماء بیٹھے تھے۔ اس نے ان سے مخاطب ہو کر کہا تم لوگ کب تک کہتے رہو گے کہ کائنات میں کوئی خدا ہے، میں اس کی نفی میں ہزار دلیلیں پیش کر سکتا ہوں۔

اس نے اس جملے کو ایک خاص غرور و تکبر کے ساتھ ادا کیا۔ مجلس میں موجود علماء چونکہ جانتے تھے کہ وہاں منطق و استلال نہیں ہے اور اقتدار نے اسے اس قدر مغرور کر دیا ہے کہ کوئی حق بات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی ہے، اس لئے انہوں نے بے اعتنائی کے ساتھ ایک بامعنی اور حقارت آمیز خاموشی اختیار کی۔

یہ واقعہ گزر گیا، ایک مدت کے بعد وزیر پر الزام لگایا گیا اور وقت کی حکومت نے اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ ان علماء میں سے ایک عالم جو اس دن اس مجلس میں موجود تھا، اس نے سوچا کہ اس شخص کی بیداری کا وقت آگیا ہے، اب جبکہ اس کا غرور ٹھنڈا ہو چکا ہے اور خود پرستی کے پردے اس کی آنکھوں سے ہٹ گئے ہیں اور حق کو قبول کرنے کی حس اس میں پیدا ہو گئی ہے اگر اس سے رابطہ قائم کیا جائے اور اس کی نصیحت کی جائے تو سودمند ہو گی۔ اس عالم دین نے اس شخص سے ملاقات کی اجازت حاصل کی اور اس سے ملاقات کرنے کے لئے جیل گیا۔ جوں ہی وہ اس شخص کے نزدیک پہنچا تو لوہے کی سلانخوں کے پیچھے اسے ایک کمرہ میں اکیلا پایا۔ وہ ٹھلتے اور سوچتے ہوئے کچھ اشعار گنگنا رہا تھا، عالم دین نے غور سے سناؤ دیکھا وہ یہ معروف اشعار پڑھ رہا تھا:

ماہمه شیر ان ولی شیر علم حملہ مان از باد باشد دم پدم!

حملہ مان پیدا و ناپیدا است باد جان فدائی آن که ناپیدا است باد !

یعنی ہماری مثال ان شیروں کے مانند ہے جو جھنڈوں پر نقش کئے جاتے ہیں، جب ہوا چلتی ہے تو وہ حرکت میں آتے ہیں گویا وہ حملہ کرتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ کچھ نہیں ہیں بلکہ یہ ہوا کا چلتا ہے جو اسے قدرت بخشتا ہے، ہم بھی جس قدر طاقتور ہو جائیں یہ طاقت ہماری اپنی نہیں ہے۔ جس خدا نے ہمیں یہ

طاقتِ دی ہے، وہ جب چاہے ہم سے واپس لے لے۔

مذکورہ عالمِ دین نے دیکھا کہ ان حالات میں نہ صرف یہ خدا کا مکر نہیں ہے بلکہ ایک شدید خداشناں بن گیا ہے۔ اس سے حال و حوال پوچھنے کے بعد کہا: یاد ہے ایک دن تم نے کہا تھا: خدا کی نفی میں ہزار دلائیں پیش کر سکتا ہوں میں اس وقت اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے ہزار دلائیں کا ایک جواب دوں خدا و منہ متعال وہ ہے جس نے تم سے اس عظیم اقتدار کو اس آسانی کے ساتھ چھین لیا، اس نے اپنا سر نیچا کر لیا اور شر مند ہو گیا اور کوئی جواب نہیں دیا کیوں کہ اس نے اپنی غلطی کا اعتراض کر لیا تھا اور وہ اپنی روح کے اندر خدا کے نور کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

قرآن مجید فرعون کے بارے میں فرماتا ہے:

(جَنَّى إِذَا أَدْرَكَ الْغُرْقَ قَالَ آمُنْتَ أَنَّهُ لِرَبِّ الْأَنْشَاءِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ إِنَّمَّا تَبَعَّدُ بِهِ بِنَوَافِرِ إِسْرَائِيلَ) (سورہ یوں، ۹۰)

”یہاں تک کہ غرقابی نے اسے (فرعون کو) پکڑ لیا تو اس نے آواز دی کہ میں اس خدائے وحدہ لا شریک پر ایمان لے آیا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں“

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ مذکورہ سچے واقعہ کو چند سطروں میں بیان کیجئے۔

۲۔ بنی اسرائیل کو کیوں بنی اسرائیل کہتے ہیں؟

۳۔ فرعون کون تھا، کہاں زندگی بر کرتا تھا اور اس کا دعویٰ کیا تھا؟

## چھٹا سبق:

خدا کی معرفت کا دوسرا راستہ

ب۔ بیرونی راستہ

هم جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس حقیقت تک پہنچتے ہیں کہ کائنات درہم برہم نہیں ہے بلکہ تمام موجودات ایک معین را پر

گامزنا ہیں اور کائنات کا نظام ایک بڑی فوج کے مانند ہے جو مختلف اور مختلف یوں میں تقسیم ہو کر ایک معین مقصد کی طرف بڑھ رہا ہے۔  
مندرجہ ذیل نکات اس سلسلہ میں ہر شبہ کو دور کر سکتے ہیں:

۱۔ ہر زندہ مخلوق کے وجود میں آنے اور باقی رہنے کے لئے ضروری ہے کچھ خاص قوانین اور حالات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے پائے جائیں۔ مثلاً ایک درخت کے وجود میں آنے کے لئے زمین، مناسب آب و ہوا اور ایک معین دھوپ اور گرمی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بیج کو ڈالا جائے اور وہ اچھی طرح سے غذا حاصل کرے، تنفس کرے، سبز ہو جائے اور نشوونما پائے۔

ان حالات کے بغیر اس کی نشوونما ممکن نہیں ہے، ان حالات کو منتخب کرنے اور ان مقدمات کو فراہم کرنے کے لئے عقل اور علم و دانش کی ضرورت ہے۔

۲۔ ہر مخلوق کا اپنا ایک خاص اثر ہوتا ہے، پانی اور آگ میں سے ہر ایک کا اپنا خاص اثر ہے، جو ان سے کبھی جدا نہیں ہوتا ہے بلکہ ہمیشہ ایک ثابت اور پابند اور قانون کی پیروی کرتا ہے۔

۳۔ زندہ مخلوقات کے تمام اعضاء آپس میں ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں مثال کے طور پر یہی انسان کا بدنه جو بذات خود ایک عالم ہے، عمل کے وقت اس کے تمام اعضاء شعوری اور لاشعوری طور پر ایک خاص ہماہنگی سے کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی خطرہ سے دوچار ہو جائے تو تمام اعضاء دفاع کے لئے متحد ہو جاتے ہیں۔ یہ نزدیک رابطہ اور تعاون، کائنات کے نظام کی ایک اور علامت ہے۔

۴۔ کائنات پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ نہ صرف ایک زندہ مخلوق کے اعضاء و جسم بلکہ کائنات کی تمام مخلوقات بھی آپس میں ایک خاص ہماہنگی رکھتی ہیں۔ مثلاً زندہ مخلوقات کی نشوونما کے لئے سورج چلتا ہے، بادل برتتا ہے، ہوا چلتا ہے، زمین اور زمین کے منابع اس کی مدد کرتے ہیں۔ یہ کائنات میں ایک معین نظام کے وجود کی نشانیاں ہیں۔

”نظم و ضبط“ اور ”عقل“، ”کارابطہ“

یہ حقیقت ہر انسان کے ضمیر پر واضح ہے کہ جہاں کہیں بھی نظم پایا جاتا ہو وہ ”عقل، فکر، نقصہ اور مقصد“ کی دلیل ہے۔  
کیونکہ انسان جہاں کہیں بھی ایک ثابت نظم و ضبط اور قوانین کا مشاہدہ کرے وہ جانتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی علم و قدرت کے ایک مبدأ کی بھی تلاش اور جتوکرنی چاہئے اور اپنے ضمیر کے اس ادراک میں کسی استدلال کی ضرورت کا حساس بھی نہیں کرتا ہے۔

وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ ایک اندازا اور ان پڑھ شخص ہر گز ایک ٹائپ مشین سے ایک اچھا مضمون یا ایک اجتماعی و تقیدی مقالہ نہیں لکھ سکتا ہے، اور ایک دوسال کا بچہ کاغذ پر نامنظم صورت میں قلم چلا کر ہر گز ایک اچھی اور گراں قیمت نقاشی نہیں کر سکتا ہے۔ بلکہ اگر ہم ایک اچھا مضمون یا گراں قیمت مقالہ دیکھتے ہیں تو جانتے ہیں کہ ایک تعلیم یافتہ اور عقل و شعور والے کسی شخص نے اسے لکھا ہے، یا گر کسی نمائش گاہ میں نقاشی کا ایک اچھا نمونہ دیکھتے ہیں تو اس بات میں شک و شبہ نہیں کرتے ہیں کہ اسے ایک ہنرمند نقاش نے بنایا ہے، اگرچہ ہم نے کبھی اس ہنرمند نقاش کو نہ دیکھا ہو۔  
اس لئے جہاں کہیں بھی نظم و ضبط پایا جائے اس کے ساتھ عقل و ہوش ضرور ہو گا اور یہ نظم جس قدر بڑا، دیقق تر اور دلچسپ ہو گا، جس علم و عقل نے اسے خلق کیا ہے وہ بھی اسی قدر بڑا ہو گا۔

بعض اوقات اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ ہر منظم چیز کے لئے عقل و دانش کے سرچشمہ کی ضرورت ہے، ریاضیات عالی میں ذکر شدہ ”احمالات کے حساب“ سے مدلی جاتی ہے اور اس طریقے سے ثابت کرتے ہیں کہ مثلاً ایک ان پڑھ شخص اگر ٹائپ مشین کے ذریعہ اتفاقی طور پر مشین کے مبنی دبائے اس سے ایک مقالہ یا چند اشعار کو لکھنا چاہیے تو ”احمالات کے حساب“ کے مطابق اس میں اربوں سال لگ جائیں گے کہ حتیٰ کرہہ زمین کی پوری عمر بھی اس کے لئے کافی نہیں ہو گی۔ (اس کی مزید وضاحت کے لئے کتاب ”آفرید گار جہاں“ یا کتاب ”در جتو خدا“ کا مطالعہ فرمائیں)

قرآن مجید فرماتا ہے:

(سُرْ يَهُمْ إِيْتَنَافِ الْأَفَاقِ وَنِيْ أَفْسُحْ حَتَّىٰ تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ لِمَنْ أَعْنَىٰ وَلِمَ يَكُفُّ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ) (سورہ فصلت، ۵۳)

”ہم عنقریب اپنی نشانیوں کو تمام اطراف عالم میں اور خود ان کے نفس کے اندر دکھائیں گے تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ وہ برحق ہے اور کیا تمھارے پروردگار کے لئے یہ بات کافی نہیں ہے۔ کہ وہ ہر شے کا گواہ اور سب کا دیکھنے والا ہے۔“

غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ صنعتی کارخانوں کی چند مثالیں (سبق میں بیان کی گئی مثال کے علاوہ) پیش کیجئے، جن کے مشاہدہ سے خالق کائنات کے وجود کا علم حاصل ہو جائے۔
- ۲۔ ”آفاق“ اور ”نفس“ میں کیا فرق ہے؟ آفاق اور نفس میں خدا کی نشانیوں کی چند مثالیں بیان کیجئے۔

## ساتوال سبق

نظام خلقت کے چند نمونے

پوری کائنات میں ”نظم“، ”مقصد“ اور ”نقشه“ کو واضح طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اب توجہ فرمائیے کہ ہم ان کے چند نمونوں کو بیان کرتے ہیں:

ہم نے یہاں پر آپ کے لئے چند چھوٹے بڑے نمونے اکٹھا کئے ہیں۔

خوشبختی سے آج طبیعی علوم میں ترقی کے نتیجہ میں عالم طبیعت میں انسان، حیوان، پودوں، خلیوں اور ایٹم کی حیرت انگیز عمارت کی ہاریک یہیں اور ستاروں کے حیرت انگیز نظام نے ہم پر معرفت خدا کے دروازے کھول دئے ہیں۔ اس لئے جرأت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ طبیعی علوم کی تمام کتابیں تو

حید اور معرفت خدا کی کتابیں ہیں، جو ہمیں عظمت پروردگار کادرس دیتی ہیں، کیونکہ یہ کتابیں کائنات کی مخلوقات کے دلکش نظام سے پرداختی ہیں اور بتاتی ہیں کہ خالق کائنات کس قدر عالم و قادر ہے۔

ملک بدن کی حکمرانی کا مرکز

ہماری کھوپڑی کے اندر خاکی رنگ کا ایک مادہ ہے، جسے ہم مغز کہتے ہیں۔ یہ مغز ہمارے بدن کے اہم ترین اور دقیق ترین حصہ کو تشکیل دیتا ہے، کیونکہ اس کا کام بدن کے تمام قوا کو فرمان جاری کرنا اور ہمارے جسم کے تمام اعضاء کو کنٹرول کرنا ہے۔ اس عظیم مرکز کی اہمیت کو بیان کرنے کے لئے مناسب ہے پہلے آپ کے لئے یہ خبر بیان کریں:

جرائد میں یہ خبر نقل کی گئی تھی کہ ایک شیرازی طالب علم کو خوزستان میں ایک ٹریف حادثہ کے نتیجہ میں مغز پر چوٹ لگ گئی تھی، بظاہر وہ سالم نظر آتا تھا۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی تمام یاد داشتیں کھو بیٹھا تھا۔ اس کا دماغ بخوبی کام کرتا تھا۔ مطالب کو سمجھتا تھا، لیکن اگر اپنے ماں یا باپ کو دیکھتا تو انھیں نہیں پہچانتا تھا۔ جب اس سے کہتے تھے کہ یہ تمہاری ماں ہے، وہ تعجب کرتا تھا۔ اسے اپنے گھر شیراز لے جایا گیا اور اس کی دستکاری۔ جو اس کے کمرہ کی دیوار پر نصب تھی۔ اسے دکھائی گئی تو وہ تعجب سے ان پر نگاہ کرنے کے بعد کہتا تھا کہ میں انھیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

معلوم ہوا کہ اس مغزی چوٹ کے نتیجہ میں اس کے دماغ کی خلیوں کا ایک حصہ، جو حقیقت میں فکر اور حافظہ کے مخزن کے درمیان رابطہ کے تارکاروں ادا کرتا ہے، پیکار ہوا ہے اور جیسے بجلی کا فیوز اڑ جانے کے نتیجہ میں بجلی منقطع ہو کرتا کی مچھیل جاتی ہے، اسی طرح اس کی سابقہ یادوں کا ایک بڑا حصہ فراموشی کی تاریکی میں ڈوب گیا ہے۔

شاید اس کے مغز کا بیکار شدہ حصہ ایک پن کی نوک سے زیادہ نہیں ہو گا، لیکن اس نے اس کی زندگی پر کس قدر اثر ڈالا ہے! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مغز کا سسٹم کس قدر پیچیدہ ہے اور اہم ہے۔

مغزاً عصاًب کا سلسہ دو اہم حصوں سے تشکیل پاتا ہے:

۱۔ ارادی اعصاب: ہمارے بدن کے تمام اختیاری حرکات، جیسے: راہ چلنے دیکھنے، باتیں کرنے و... کا سرچشمہ اعصاب کا یہی حصہ ہے۔

۲۔ غیر ارادی اعصاب: اعصاب کا یہ حصہ، دل کی دھڑکن، معدہ وغیرہ جیسے اعضاء کا کنٹرول کرتا ہے۔ مغز کے اس حصہ کا ایک ذرہ بیکار ہونے کے نتیجے میں ممکن ہے انسان کا قلب یا کوئی دوسرا عضو محتل ہو کر رہ جائے۔

دماغ کا ایک عجیب و غریب حصہ :

”خ“ (بھیجا) دماغ کا دو چھوٹا حصہ ہے جو دماغ کے دو حصوں کے درمیان واقع ہے، مغز کا یہ بالکل چھوٹا حصہ ہوش، ارادہ اور شعور کا مرکز ہے۔ یہ مغز کا ایک اہم ترین حصہ ہے، بہت سے جذباتی رد عمل، جیسے غضب اور ترس وغیرہ اسی سے مر بوطیں۔

اگر کسی جانور کا ”خ“ الگ کر دیا جائے، لیکن اس کے باقی اعصاب اپنی جگہ پر صحیح و سالم ہوں تو وہ جانور زندہ رہتا ہے لیکن فہم و شعور کو بالکل ہی کھو دیتا ہے۔ ایک کبوتر کا ”خ“ کلاگیا۔ وہ ایک مدت تک زندہ رہا۔ لیکن جب اس کے سامنے دانہ ڈالتے تھے وہ اسے تشخیص نہیں دے سکتا تھا اور بھوکا ہونے کے باوجود اسے نہیں کھاتا تھا۔ اگر اسے اڑاتے تھے، تو وہ پرواز ہی کرتا رہتا تھا، یہاں تک کہ کسی چیز سے نکل کر گرجاتا تھا۔

دماغ کا ایک اور جیزت الگیز حصہ، ”حافظہ“ ہے۔

کیا آپ نے اس پر غور کیا ہے کہ ہمارا قوہ حافظہ کس قدر حیرت انگیز ہے؟ اگر ایک گھنٹہ کے لئے ہم سے حافظ چھین لیا جائے تو ہم کس مصیبت سے دوچار ہو جائیں گے؟!

حافظ کامر کرن، جو ہمارے دماغ کا ایک چھوٹا حصہ ہے، ہماری پوری عمر کی یادوں کو تمام خصوصیات کے ساتھ ریکارڈ کرتا ہے۔ جس شخص نے بھی ہم سے رابطہ قائم کیا ہوا، اس کی تمام خصوصیات جیسے، قد، شکل و صورت، رنگ، لباس، اخلاق اور جذبات کو ریکارڈ کر کے محفوظ رکھتا ہے اور ہر ایک کے لئے ایک الگ فائل تفصیل دیتا ہے۔ لہذا جو ہی ہم اس شخص سے رو بڑو ہوتے ہیں، ہماری فکر تمام فائلوں میں سے اس شخص کی فائل کو نکال کر فوری طور پر اس کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس کے بعد ہمیں حکم دیتی ہے کہ ہم اس کے مقابلہ میں کون سارہ عمل ظاہر کریں۔

اگر وہ دوست ہے تو اس کا احترام کریں اور اگر دشمن ہے تو انہمار نفرت کریں۔ لیکن یہ تمام کام اس قدر سرعت کے ساتھ انجام پاتے ہیں کہ وقت کے ذریسا بھی فاصلہ کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اس مسئلہ پر تجربہ اس وقت اور زیادہ ظاہر ہوتا ہے جب ہم اپنے حافظ میں موجود چیزوں کو تصویر کے ذریعہ کاغذ پر ترسیم کرنا چاہیں یا انھیں کیسٹ میں ضبط کرنا چاہیں تو ہم بیشک کاغذ اور کیسٹ کی بڑی تعداد کو مصرف میں لاتے ہیں جو ایک انبار کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ عجیب تر یہ ہے کہ ان کیسٹوں اور کاغذات میں سے ایک کو باہر نکالنے کے لئے ہمیں بہت سے مامورین کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے، جبکہ ہمارا حافظہ ان تمام کاموں کو آسانی کے ساتھ فی الفور انجام دیتا ہے۔

بے شعور طبیعت کیسے باشعور چیزوں کی تخلیق کر سکتی ہے؟

انسان دماغ کے عجائب کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بعض کا لجوں اور یونیورسٹیوں کی کتابوں میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ کیا اس پر باور اور یقین کیا جاسکتا ہے کہ یہ غیر معمولی، انوکھا، دقیق، یچیدہ اور پراسرار دماغ کسی بے شعور طبیعت کی تخلیق ہو گی؟ اس سے بڑھ کر کوئی بات تعجب انگیز نہیں ہو سکتی ہے کہ ہم بے عقل طبیعت کو عقل کا خالق جانیں!

قرآن مجید فرماتا ہے:

(وَنِي أَنْسَكْمُ أَفْلَا تَبْصِرُونَ) (ذاريات، ۳۱)

”خود تمہارے اندر بھی (خدا کی عظمت اور قدرت کی بڑی نشانیاں ہیں) کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو؟“

غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ کیا آپ انسانی دماغ کے عجائب کے بارے میں کچھ اور مطالب جانتے ہیں؟
- ۲۔ خداوند متعال نے گوناگون حادث کے مقابلہ میں انسانی دماغ کے تحفظ کے لئے کون سی تدبیریں کی ہیں؟

## آٹھواں سبق

اکچھوٹ سے پرندے میں حیرت انگیز دنیا

چੁਗکاڈڑ اور اس کی عجیب خلقت  
اس درس میں ہم اپنے بدن کے عظیم ملک سے۔۔۔ کہ ہم نے اس کے سات شہروں میں سے ایک گلی کی بھی سیر نہیں کی ہے۔۔۔ باہر آ کر تمیزی کے ساتھ  
ادھر ادھر گوم پھر کر مخلوقات کے حیرت انگیز نظام کے چند نمونے اکٹھا کریں گے:  
ہم رات کی تاریکی میں آسمان پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ہم ظلمت کے پردوں کے درمیان ایک غیر معمولی پرندے کو پر اسرار سایہ کی صورت میں دیکھتے ہیں  
جو پوری شجاعت کے ساتھ اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے ہر طرف پر واز کر رہا ہے۔  
یہ پرندہ وہی ”چੁਗکاڈڑ“ ہے، جس کی ہر چیز عجیب ہے۔ لیکن رات کی تاریکی میں اس کی پر واز عجیب تر ہے۔  
اندھیری رات میں چੁਗکاڈڑ کا انتہائی سرعت کے ساتھ پر واز کرنا اور کسی چیز سے اس کا نہ ٹکرانا اس قدر تعجب انگیز ہے کہ جتنا بھی اس پر غور کیا جائے اس پر  
اسرار پرندہ کے بارے میں نئے نئے اسرار معلوم ہوتے ہیں۔  
یہ پرندہ رات کی تاریکی میں اسی سرعت و شجاعت کے ساتھ پر واز کرتا ہے کہ جیسے ایک تیز اڑنے والا کبوتر دن کے اجائے میں پر واز کرتا ہے۔ یقیناً گراس  
پرندہ میں مانع کے بارے میں اطلاع دینے کا کوئی وسیلہ نہ ہوتا تو بڑی احتیاط سے اور آہستہ پر واز کرتا۔

اگر اس پر نہ کوایک تنگ و تاریک اور پر چچ و خم اور سیاہی سے بھرے ٹھل (سرنگ) میں چھوڑ دیا جائے تو وہ تمام چچ و خم سے گز جاتا ہے بغیر اس کے کہ ایک بار بھی ٹھل کی دیوار سے ٹکرائے اور ایک ذرہ سیاہی بھی اس کے پروں پر بیٹھے چگاڈڑ کی یہ عجیب حالت اس کے وجود میں پائی جانے والی خاصیت کے سبب ہے جو کہ راڈار کی خاصیت کے ماند ہے۔

یہاں پر ہمیں راڈار کے بارے میں تھوڑی سی آگاہی حاصل کرنی چاہئے تاکہ ہمیں اس چھوٹے سے چگاڈڑ میں اس راڈار کی حالت معلوم ہو جائے۔ علم فنریکس میں آواز کے سلسلہ میں ماورائے صوت کی امواج کے بارے میں ایک بحث ہے۔ یہ وہی امواج ہیں جن کا وقfa اور طول اس قدر زیادہ ہے کہ انسان کے کان اسے درک کرنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں، اسی لئے انھیں ماورائے صوت کہتے ہیں۔

جب اس قسم کی امواج کوایک قوی ٹرانسیمیٹر کے ذریعہ ایجاد کیا جاتا ہے، تو یہ امواج ہر طرف پھیلتی ہیں۔ لیکن جوں ہی فضامیں کسی جگہ پر کسی رکاوٹ (دشمن کے جہاز یا کسی اور مانع) سے ٹکراتی ہیں ایک فٹ بال کے دیوار سے ٹکرانے کے مانند اپس پلٹتی ہیں بالکل اسی طرح کہ جب ہم ایک اوپنے پہاڑ یا دیوار کے سامنے آواز بلند کرتے ہیں تو اس آواز کی گونج پہاڑ یا دیوار سے ٹکرا کر واپس لوٹتی ہے۔ ان امواج کی بازگشت کی مدت کے مطابق اس مانع کے فاصلہ کا صحیح انداز کیا جاسکتا ہے۔

بہت سے ہوائی جہازوں اور کشتیوں کو راڈار کے ذریعہ سے ہی بدایت کی جاتی ہے جہاں کہیں بھی وہ جانا چاہیں۔ اسی طرح دشمن کے ہوائی جہاز اور کشتیوں کو معلوم کرنے کے لئے بھی راڈار سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

سانسند انوں کا کہنا ہے کہ اس چھوٹے سے پرندہ میں راڈار کے مانند ایک مشین موجود ہے۔ اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ اگرچہ کاڈڑ کوایک بند کرے میں پرواز کرائیں اور اسی لمحہ ماورائے صوت کی امواج کو سننے کے قابل امواج میں تبدیل کرنے والے ایک مانیکروfon کو کھڑے میں رکھا جائے تو پورے کرہ میں ایک نامفہوم گوش خراش آواز پھیل جائے گی اور ہر سینٹ میں ۳۰ سے ۲۰ مرتبہ ماورائے صوت کی امواج چگاڈڑ سے سنی جائیں گی۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چگاڈڑ کے کس عضو سے یہ امواج پیدا ہوتی ہیں یعنی اس کا ٹرانسیمیٹر کون سا عضو ہے اور مانیکروfon کون سا عضو ہے؟ اس سوال کے جواب میں سانسند ان کہتے ہیں: یہ امواج چگاڈڑ کے حلق کی نالی کے قوی پھیلوں سے پیدا ہوتی ہیں اور اس کی نالک کے سوراخوں سے باہر نکلتی ہیں اور اس کے بڑے کان امواج کو حاصل کرنے میں مانیکروfon کا کام انجام دیتے ہیں۔

اس لئے چگاڈڑ انہی رات کی اپنی سیر و سیاحت کے دوران اپنے کانوں کا مر ہون منت ہے۔ ”جورین“ نامی ایک رو سی سانسند ان نے تجربے سے ثابت کیا ہے کہ اگرچہ چگاڈڑ کے کان کاٹ دئے جائیں تو وہ تار کی میں کسی مانع سے ٹکرائے بغیر پرواز نہیں کر سکتا ہے۔ جبکہ اگر اس کی آنکھوں کو بالکل ہی نکال دی جائے تو پھر بھی وہ پوری مہارت سے پرواز کر سکتا ہے، یعنی چگاڈڑ اپنے کانوں سے دیکھتا ہے، نہ اپنی آنکھوں سے اور یہ ایک عجیب چیز ہے۔ (تو جہ کیجھ (!!

اب ذرا غور کیجھ کہ اس چھوٹے سے پرندہ کے اس ناک جسم میں ان دو عجیب اور حیرت انگیز مشینوں کو کس نے خلق کیا ہے اور ان سے استفادہ کرنے کے طریقہ کو کس نے اسے سکھایا ہے تاکہ اس اطمینان بخش وسیلہ کے ذریعہ رات کے وقت اپنی پرواز کے دوران بہت سے خطرات سے محفوظ رہ سکے؟... واقعاً کس نے سکھایا ہے؟

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بے شعور اور بے عقل طبیعت ایسا کام انجام دے سکے؟ اور ایک ایسی مشین کو آسانی کے ساتھ اس پر نہ کے بدن میں قرار دے

، جسے بڑے بڑے سائنسدان کافی رقامت خرچ کر کے بناتے ہیں؟

شاعر کہتا ہے:

شائستہ تائش آن آفریدہ گاری اس کار چینن دلاویز نقشی زماء و طین

وہ خالق جہاں ہی تعریف کے ہی لائق جو آب و گل دکش جہاں بنادے

امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے نجی الملامہ میں چگاڈڑ کی خلقت کے بارے میں ایک مفصل خطبہ میں فرمایا ہے:

”لَا تُمْتَنِعْ مِنَ الْمُضْنِفِيَّةِ لِضُيقِ دُجْنَتِكَ... فَسُبْحَانَ الْبَارِيِّ لِكُلِّ شَيْءٍ عَلَىٰ غَيْرِ مِثْلِهِ“ (خطبہ، ۱۵۵)

”وہ (چگاڈڑ) شدید اندر ہیرے کی وجہ سے ہر گز اپنی راہ سے پیچھے نہیں پہنچتا ہے... پاک و منزہ ہے وہ خدا جس نے کسی نمونہ کے بغیر ہر چیز کو خلق کیا ہے۔“

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ چگاڈڑ کی خلقت کے بارے میں آپ کونے مزید لچسپ اطلاعات رکھتے ہیں؟

۲۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ چگاڈڑ کے پر، پنجے کی پرورش کا طریقہ اور یہاں تک کہ اس کا سونا دوسرا ہے حیوانات سے متفاوت ہے یعنی یہ مکمل طور پر ایک استثنائی پر نہ ہے؟

## نوال سبق

حشرات اور پھولوں کی دوستی!

موسم بہار میں ایک دن، جب ہوار فتہ رفتہ گرم ہو رہی ہو، سر سبز اور خوبصورت باغوں اور کھیتوں کی ایک سیر کیجئے۔ آپ وہاں پر چھوٹے چھوٹے حشرات، شہد کی مکھیاں، طلائی مکھیاں، بتلیاں اور چھوٹے چھوٹے پھرلوں کو گروہوں کی صورت میں مشاہدہ کریں گے جو آہستہ آہستہ کسی قسم کے شور و غل کے بغیر ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں، ایک پھول سے اٹھ کر دوسرے پھول کی طرف پرواز کرتے ہیں ایک ٹھنی سے دوسری ٹھنی کی طرف اڑتے ہیں۔

یہ حشرات اس قدر سرگرم عمل ہیں کہ جیسے کوئی مرموط طاقت ایک منتظم کے مانند انھیں حکم دیتی ہے اور ایک کارخانہ میں وردی پوش مزدوروں کی طرح ان کے پروبال پھولوں کی زردی سے آغشته ہو کر مزدوروں کی شکل و صورت اختیار کر لیتے ہیں اور نہایت تندا اور لگن سے اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

حقیقت میں یہ ایک اہم ماموریت اور کام انجام دیتے ہیں۔ ان کی یہ ماموریت اس قدر عظیم ہے کہ پروفیسر رلوں برٹن اس سلسلہ میں کہتا ہے: ”بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ حشرات کے وجود کی بغیر ہمارے میوؤں کی ٹوکریاں خالی پڑی رہ جائیں گی...“

ہم اس دانشور کے قول کے ساتھ اس جملہ کا اضافہ کرتے ہیں: ”برسون کے بعد ہمارے باغ اور لہلہتے کھیت اس طراوت اور شادابی کامل طور پر کھو دیں گے۔“ اس لئے حقیقت میں حشرات میوؤں کی پروش کرنے والے اور پھولوں کے تیج میتا کرنے والے ہیں۔

آپ ضرور پوچھیں گے کیوں کر؟ اس لئے کہ پودوں کا حساس ترین حیاتی عمل یعنی عمل لقاح (fertilization) انہی حشرات کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ آپ نے ضرور یہ بات سنی ہو گی کہ بہت سے حیوانوں کے مانند پھولوں میں نرم و مادہ پائے جاتے ہیں اور جب تک ان کے درمیان ملاپ اور پیوند کا کام انجام نہ پائے، تیج، دانہ اور ان کے نتیجے میں میوه حاصل نہیں ہو گا۔

لیکن کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ پودوں کے بے حس و حرکت مختلف حصے کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جذب ہوتے ہیں اور نرم پھولوں کی غلیبی، جو مرد کے نطفہ (sperm) کے حکم میں ہے، مادہ پھولوں کی خلیہ سے، جو مادہ کے نطفہ ( ) کے حکم میں ہے، ملتی ہے اور ان کے درمیان ازدواج کے مقدمات فراہم ہوتے ہیں؟

یہ کام بہت موقع پر حشرات کے ذریعہ انجام پاتا ہے اور بعض مواقع پر ہواؤں کے ذریعہ۔

لیکن یہ بات اتنی آسان نہیں ہے جیسا ہم خیال کرتے ہیں۔ یہ مبارک اور بابرکت نکاح جو حشرات کی خواستگاری سے انجام پاتا ہے۔ اس کی ایک جیزت

انگیز اور طولانی تاریخ ہے۔ یہاں پر ہم اس کی ایک جملک پیش کرتے ہیں:

دو قدری اور جگری دوست

علم طبیعت کے سائنسدان مطالعات و تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نباتات اور پھول زمین شناسی کے دوسرے دور کے دوسرے حصہ میں وجود میں آئے ہیں۔ تجربہ کی بات ہے کہ اسی دوران میں حشرات بھی وجود میں آئے ہیں اور یہ دونوں حوادث و واقعات سے پُر خلقت کی پوری تاریخ میں ہمیشہ دو فادر اور جگری دوستوں کے مانند زندگی بس رکرتے ہوئے ایک دوسرے کے لازم و ملزم رہے ہیں۔

پھولوں نے اپنے دائیگی دوستوں کی محبت کو حاصل کرنے کے لئے ایک بہت ہی لذیز مٹھائی کو اپنے اندر رکھیرہ کیا ہے اور جب حشرات نر پھولوں کی خلیہ کو پیوند اور لقاح کے مقدمات مہیا کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے زحمت اٹھاتے ہوئے پھولوں کے اندر داخل ہوتے ہیں! تو پھول انھیں اس مٹھائی کو مفت میں پیش کرتے ہیں، یہ مخصوص قند حشرات کے لئے اتنا مٹھا اور لذیز ہوتا ہے کہ انھیں بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

علم نباتات کے بعض ماہرین کا اعتقاد ہے کہ پھولوں کے خوبصورت رنگ اور خوشبو بھی حشرات کو اپنی طرف کھینچنے میں موثر ہیں۔ شہد کی مکھیوں پر کئے گئے تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ وہ گلوں کو تشخیص دیتی ہیں اور پھولوں کی خوشبو کو درک کرتی ہیں۔

حقیقت میں یہ پھول ہیں جو خود کو حشرات کے لئے سجائتے ہیں اور خوشبو پھیلاتے ہیں تاکہ بازوں تیلیوں اور نفاست پسند شہد کی مکھیوں کو اپنی طرف کھینچ لیں۔ وہ بھی دل کھول کر اس دعوت کو قبول کر کے کام کے مقدمات کو فراہم کرتے ہوئے ان کی مٹھائی کو تناول کرتے ہیں۔ یہی مٹھائی اور خاص قند ہے جو حشرات کی غذا شمار ہوتی ہے اور جب یہ بہت ڈھیر ہو جاتی ہے تو یہی شہد بن جاتا ہے۔ کیونکہ جب حشرات پھولوں کے پاس آتے ہیں، تو اس مٹھائی سے تھوڑا سا کھاتے ہیں اور اس کا زیادہ تر حصہ بے تکلف مہماں کی طرح اپنے ساتھ لے جا کر اپنے چھتوں میں ذخیرہ کرتے ہیں۔ پھولوں اور حشرات کے درمیان دوستی و محبت کا یہ معابدہ دو طرفہ منافع کی بنیاد پر ہمیشہ تھا اور رہے گا۔

توحید کا ایک درس

جب انسان حشرات اور پھولوں کی زندگی میں ان جیرت انگیز نکات کا مطالعہ کرتا ہے، تو غیر شعوری طور پر اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہے: پھولوں اور حشرات کے درمیان اس دوستی و محبت کے عہد و بیان کو کس نے برقرار کیا ہے؟

پھولوں کو یہ مخصوص مٹھاں اور لذیز غذا کس نے دی ہے؟ یہ دلکش اور خوشمار نگ اور یہ خوشبو پھولوں کو کس نے عطا کی ہے کہ اس طرح حشرات کو اپنی طرف دعوت کرتے ہیں؟

حشرات، تیلیوں، شہد کی مکھیوں اور بھڑوں کو یہ نازک پاؤں اور خوبصورت اندام کس نے عطا کئے ہیں تاکہ پھولوں کی خلیہ کو نقل و انتقال دینے کے لئے مستعد و آمادہ رہیں؟

شہد کی کھیاں کیوں ایک مدت تک خاص ایک ہی قسم کے پھولوں کی طرف رج کرتی ہیں اور پھولوں اور حشرات کی خلقت کی تاریخ کیوں ایک ساتھ شروع ہوئی ہے؟

کیا کوئی شخص، جس قدر بھی ہٹ دھرم ہو، باور کر سکتا ہے کہ یہ سب واقعات پہلے سے مرتب ہوئے کسی نقشہ اور منصوبہ کے بغیر انجام پائے ہیں؟ اور

فطرت کے بے شعور قوانین ان حیرت انگیز مناظر کو خود مخدود جو دمیں لائے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں...

قرآن مجید فرماتا ہے:

(وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَيْكُمْ أَنَّ الْجَنَّةَ مِنْ أَنْجَىٰ مَا يُبَرِّزُونَ  
شَكَلِيٌّ مِّنْ كُلِّ الْثَّمَرَاتِ فَاسْكُنْهُمْ فِي سَلَقَةٍ  
أَوْ تَمَّارِيٍّ وَمَلِيعَرِ شَوَّنَ  
”او حَلِيٌّ رَبَّكَ إِلَيْكُمْ أَنَّ الْجَنَّةَ مِنْ أَنْجَىٰ مَا يُبَرِّزُونَ  
شَكَلِيٌّ مِّنْ كُلِّ الْثَّمَرَاتِ فَاسْكُنْهُمْ فِي سَلَقَةٍ  
أَوْ تَمَّارِيٍّ وَمَلِيعَرِ شَوَّنَ  
”اور تمہارے پروڈگار نے شہد کی کھی کوا شاہدہ دیا کہ پھراؤں اور درختوں اور گھروں کی بلندیوں میں اپنے گھر بنائے اس کے بعد مختلف پھلوں سے غذا حاصل کرے اور نرمی کے ساتھ خدائی راستہ پر چلے۔“

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ پھلوں کی تھیں میں پائی جانے والی مٹھاں اور ان کے رنگ و خوشبو کے کیا فائدے ہیں؟

۲۔ شہد کی کھیوں کی زندگی کے عجائب میں سے آپ کیا جانتے ہیں؟

## دسوال سبق

نہلیت چھوٹی مخلوقات کی دنیا

چونکہ ہم اس عالم خاقت کے عجائب کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے ساتھ رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم ان حیرت انگیز مخلوقات کی اہمیت سے اکثر غافل رہ جاتے ہیں، مثال کے طور پر:

۱۔ ہمارے ارد گرد بہت چھوٹے چھوٹے حیوات اور حشرات پائے جاتے ہیں۔ کہ شاید ان میں سے بعض کا جسم ایک یادو میں میٹر سے زیادہ نہیں ہو گا، پھر بھی یہ حیوات ایک بڑے حیوان کے مانند ہاتھ پاؤں، آنکھیں اور کان، یہاں تک کہ دماغ و ہوش، پھلوں کا سلسہ اور نظام ہاضمہ رکھتے ہیں۔ اگر ہم ایک چیزوں کے دماغ کو مائیکرو سکوپ کے نیچے رکھ کر اس کی حیرت ناک بنادٹ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کیا عجیب اور دلچسپ بنادٹ ہے! اس کے مختلف حصے، جن میں سے ہر ایک حصہ اس چیزوں کے چھوٹے سے انداز کے ایک حصہ کا کنڑوں سنبھالے ہوئے ہے، ایک دوسرے کے ساتھ منظم صورت میں قرار پائے ہیں اور ان کی حالت میں معمولی سا خلل ان کے بدن کے ایک ہی حصہ کو مفلوج کرتا ہے۔

تجب اور حیرت کی بات ہے کہ اس چھوٹے سے دماغ میں، جو یقیناً ایک پن کی نوک سے بھی بہت چھوٹا ہے، ہوش، ذہانت، تمدن، ذوق اور ہنر کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ بہت سے سائنسدانوں نے سالہا سال تک اس حیوان کی زندگی کے حالات پر تحقیق و مطالعہ کرنے میں اپنی عمر صرف کی ہے اور اس کے بارے میں دلچسپ اور حیرت انگیز نکات اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں۔

کیا جس نے اس قسم کے ایک چھوٹے سے حشرہ میں اس قدر ہوش، فطانت اور ذوق کو جمع کر دیا ہے، وہ ایسی طبیعت ہو سکتی ہے جس میں ایک سوئی کی نوک کے برابر ہوش و ذہانت نہ ہو؟

۲۔ ایٹم کی پراسرار دنیا کے بارے میں، ہم جانتے ہیں کہ سب سے چھوٹی مخلوق جس کے بارے میں بشر کو بتاب معلومات حاصل ہوئی ہیں ایٹم اور اس کے اجزاء ہیں۔ ایٹم اتنا چھوٹا ہے کہ طاقتوترین مائیکرو سکوپ، جو ایک تینکے کو پہاڑوں کی شکل میں دکھاتا ہے، وہ بھی اسے دیکھنے میں عاجز ہے۔ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ ایٹم کتنا چھوٹا ہے، تو بس اس قدر جانئے کہ پانی کے ایک قطرہ میں روئے زمین کی پوری آبادی سے زیادہ ایٹم موجود ہیں۔ اگر ہم ایک سینٹی میٹر باریک ترین تار کے پر ڈٹونوں کو گنجانچاہیں اور ایک ہزار افراد سے مدد بھی لیں اور ہر سینٹی میٹر میں ہر شخص ایک پر ڈٹوں کو جدا کرے تو ۳۰۰ سال تک ایٹم کے اختلاف کے مطابق ہمیں دن رات بیدار رہنا پڑے گا تاکہ ان کو گن سکیں۔

اب جبکہ ہمیں معلوم ہوا کہ ایک سینٹی میٹر باریک تار میں اس قدر ایٹم موجود ہیں، تو ذرا سوچئے آسمان، زمین، آب و ہوا، کہکشاں اور ہمارے منظومہ شمسی میں کتنے ایٹم ہوں گے؟ کیا انسان کا ذہن اس کے تصور سے خستہ نہیں ہو جائے گا اور خالق کائنات کے علاوہ کوئی اس کا حساب لگاسکتا ہے؟

ایٹم، توحید کا درس دیتے ہیں

آج کل کی سائنسی بحث میں ایٹم شناسی اہم ترین بحث ہے۔ یہ انتہائی چھوٹی مخلوق ہمیں توحید کا درس دیتی ہے، کیونکہ ایٹم کی دنیا میں دوسری چیزوں سے زیادہ اس کے مندرجہ ذیل چار نکتے توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتے ہیں:

۱۔ غیر معمولی نظم و ضبط۔ اب تک ایک سو سے زیادہ عناصر مخفف ہوئے ہیں۔ ان کے الیکٹرون تدریج آیک سے شروع ہو کر ایک سو سے زیادہ پر ختم ہوتے ہیں۔ یہ عجیب نظام ہر گز کسی بے شعور عامل کا پیداوار نہیں ہو سکتا ہے۔

۲۔ قوتوں کا توازن۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک دوسرے کی مخالف بر قی رویں ایک دوسرے کو جذب کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے ایک ایٹم کے اندر موجود الیکٹرون جو منفی بر قی رکھتے ہیں، ان کا مرکز (nucleus)، جو ثابت بر قی روکا حامل ہے، ان کا ایک دوسرے کو جذب کرنا چاہئے۔ اور دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ نیو کلیس کے گرد الیکٹرونوں کی گردش سے قوہ دافعہ (مرکز سے دور ہونے کی طاقت) وجود میں آتی ہے۔ اس لئے یہ قوہ دافعہ الیکٹرونوں کو ایٹم کے دائرہ سے دور کرنا چاہتی ہے تاکہ ایٹم کا تجزیہ ہو جائے اور ادھر سے قوہ جاذبہ الیکٹرونوں کو جذب کر کے ایٹم کو نابود کرنا چاہتی ہے۔

یہاں پر قابل توجہ بات ہے کہ ایٹموں کے اندر کس دقيق حساب سے قوہ جاذبہ دافعہ منظم ہوئی ہیں کہ الیکٹرون نہ بھاگتے ہیں اور نہ جذب ہوتے ہیں، بلکہ ہمیشہ ایک توازن کی حالت میں اپنی حرکت کو جاری رکھتے ہوئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس توازن کو ایک اندھی اور بھری طبیعت نے وجود میں لا یا ہو؟

۳۔ ہر ایک اپنے معین راستہ پر گامزن ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ بعض ایٹموں کے متعدد الیکٹرون ہوتے ہیں لیکن یہ سب الیکٹرون ایک مدار پر حرکت نہیں کرتے، بلکہ یہ متعدد مداروں پر حرکت کرتے ہیں۔

یہ الیکٹرون لاکھوں سالوں سے ایک معین فاصلہ پر اپنے حدود میں بڑی تیزی کے ساتھ حرکت میں ہیں اور ان میں آپس میں کسی قسم کا تکرار اپیدا نہیں ہوتا ہے۔

کیا ان میں سے ہر ایک کو ان کے معین مداروں میں قرار دینا اور ایک حیرت انگیز نظام کے ساتھ ان کو حرکت میں لانا ایک آسان کام ہے؟

۴۔ ایٹم کی عظیم طاقت۔

ایٹم کی طاقت کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اس بات پر غور کرنا کافی ہے:

۱۹۳۵ء میں میلکسیکو کے ایک بے آب و علف صحرائیں ایک ایئی تجربہ انجام دیا گیا۔ ایک چھوٹے سے ایٹم بہب کو ایک فولادی ٹاور پر چھوڑ دیا گیا۔ اس نے پھٹنے کے بعد اس فولادی ٹاور کو پانی میں تبدیل کر دیا اور ایک مہیب بجلی اور آواز بلند ہوئی۔ جب سائنسدان اس جگہ پر پہنچ ٹوٹا کا کوئی نام و نشان نہیں پایا۔

اسی سال جاپان پر دو چھوٹے ایٹم بم پھینکے گئے۔ ایک کو شہر ناکا ساکی پر اور دوسرے کو شہر ہیر و شیما پر۔ پہلے شہر میں ۵۰ ہزار لوگ ہلاک ہو گئے اور اتنے ہی لوگ مجروم ہوئے اور دوسرے شہر میں ۳۰ سے ۳۰ ہزار لوگ ہلاک ہو گئے اور اتنے ہی لوگ مجروم بھی ہوئے، جس کے نتیجے میں جاپان نے مجرور ہو کر امریکہ کے سامنے بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈال دئے۔

کیا ایٹم کے صرف ایک ذرہ کے اسرار کا مطالعہ کرنا انسان کو خالق کائنات کی معرفت حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟

لہذا ثق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے پاس کائنات میں موجود ایٹموں کی تعداد کے برابر خدا کے وجود کے دلائل موجود ہیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

(ولوَّ أَنْمَافُ الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٍ وَالْحَرَيْدَهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَهُ أَبْرَجَ مَا نَفَرَتْ كَلَمَاتُ اللَّهِ) (سورہ لقمان، ۲۷)

”اور اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر کا سہار دینے کے لئے سات سمندر اور آجائیں تو بھی کلمات اللہ تمام ہونے والے نہیں ہیں۔“

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ کیا آپ چیزوں کی زندگی کے اسرار کے بارے میں کچھ اور معلومات رکھتے ہیں؟

۲۔ کیا آپ ایک ایم کی بناؤٹ کا خاکہ تنختنے سیاہ پر کھینچ سکتے ہیں؟

# دسویں سبق کی ایک تکمیلی بحث

خداوند متعال کی عظیم الشان صفات

صفات خدا

قابل غور بات ہے کہ جس قدر خلقت کائنات کے اسرار کا مطالعہ کرنے کے طریقہ سے خدا کو پانا یعنی وجود خدا کے بارے میں علم حاصل کرنا آسان ہے، اسی قدر خداوند متعال کی صفات کو بھی وقت اور کافی احتیاط کے ساتھ پہچانے کی ضرورت ہے۔

آپ ضرور پوچھیں گے کیوں؟ اس کی دلیل واضح ہے، کیونکہ خداوند متعال ہماری کسی چیز سے یا جو کچھ ہم نے دیکھا ہے یا سنا ہے ان سب سے شبہت نہیں رکھتا ہے۔ اسی لئے خدا کی صفت کو پہچاننے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اس مقدس ذات سے مخلوقات کی تمام صفات کی نفی کریں۔ یعنی خداوند عالم کو اس محدود عالم طبیعت کی مخلوقات میں سے کسی ایک سے بھی تشبیہ نہ دیں یہ ایک بہت ہی نازک مرحلہ ہے، کیونکہ ہم اس طبیعت کے اندر نشوونما پائے ہیں، ہم طبیعت سے متصل و مرتبہ ہیں، اس سے اُنس پیدا کر چکے ہیں، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہر ایک چیز کو اس کے پیمانہ پر تو لیں۔

دوسرے الفاظ میں ہم نے جو دیکھا ہے وہ جسم اور جسم کی خاصیت رکھنے والی چیزیں تھیں، یعنی ایسی موجودات جو ایک معین زمان و مکان کی حامل تھیں، ان کے مخصوص ابعاد اور اشکال تھیں۔ اس حالت میں ایک ایسے خدا کا تصور کہ نہ جسم رکھتا ہے اور نہ زمان و مکان، اس کے باوجود تمام زمان و مکان پر وہ احاطہ رکھتا ہے اور ہر لحاظ سے لامدد و دہے، ایک مشکل کام ہے۔ یعنی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس راستہ پر وقت کے ساتھ قدم رکھیں۔

لیکن اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا انتہائی ضروری ہے کہ ہم خداوند متعال کی ذات کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتے اور اس کی ہمیں توقع بھی نہیں رکھنی چاہئے، کیونکہ اس قسم کی توقع اس بات کے مانند ہے کہ ہم یہ توقع رکھیں کہ ایک عظیم سمندر کو ایک چھوٹے سے کوزے میں سودیں یا مال کے بطن میں موجود پچے کو باہر کی تمام دنیا سے مطلع کر دیں، کیا ایسا ممکن ہے؟

اس نازک مرحلہ پر ممکن ہے ایک چھوٹی لغفرش انسان کو معرفت خدا کے راستے سے کوسوں دور لے جا کر چھینک دے اور بت پرستی و مخلوق پرستی کی سنگلاх وادیوں میں آوارہ کر دے۔ (توجہ کجھے!) مختصر یہ کہ ہمیں ہوشیار ہنا چاہئے کہ صفات خدا کی مخلوقات کی صفات سے کبھی موازنہ نہ کریں۔

صفات جمال و جلال

عام طور پر خداوند متعال کی صفات کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے: صفات ثبوتیہ یعنی وہ صفات جو خداوند متعال میں پائی جاتی ہیں اور صفات سلبیہ یعنی وہ صفات جن سے خداوند متعال منزہ ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوند متعال کی ذات کتنی صفتیں کی مالک ہے؟ اس کا جواب یہ ہے: خداوند متعال کی صفات ایک لحاظ سے لامدد و دیں اور دوسرے لحاظ سے خداوند متعال کی تمام صفات ایک صفت میں خلاصہ ہوتی ہیں کیونکہ خداوند متعال کی تمام ثبوتی صفات کو مندرجہ ذیل ایک جملہ میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

خداوند متعال کی ذات، ہر جہت سے لا محمد و داور تمام کمالات کی مالک ہے۔

اس کے مقابلہ میں سلبی صفات بھی اس جملہ میں خلاصہ ہوتی ہیں: ذات باری تعالیٰ میں کسی لحاظ سے کوئی نقص نہیں ہے۔

لیکن چونکہ دوسرے لحاظ سے کمالات اور نقص کے درجات ہیں، یعنی لا محمد و کمال اور لا نقص کا تصور کیا جاسکتا ہے، لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ خداوند متعال لا محمد و صفات ثبوتیہ اور لا نقص کا تصور کیا جائے وہ خدا میں موجود ہے اور جس نقص کا بھی تصور کیا جائے خداوند متعال اس سے پاک و منزہ ہے۔ لہذا خداوند متعال کی ثبوتی و سلبی صفات لا محمد و ہیں۔

خدا کی مشہور ترین صفات ثبوتیہ

خداوند متعال کی معروف ترین صفات ثبوتیہ وہی ہیں، جن کو مندرجہ ذیل مشہور شعر میں ذکر کیا گیا ہے:

عالم و قادر و حی است و مرید و مرک هم قدیم از لی پس متکلم صادق

۱۔ خداوند متعال عالم ہے، یعنی ہر چیز جانتا ہے۔

۲۔ قادر ہے، یعنی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۳۔ حی ہے، یعنی زندہ ہے، کیونکہ زندہ موجود وہ ہے جو علم و قدرت رکھتا ہو چونکہ خداوند متعال عالم و قادر ہے، اس لئے زندہ ہے۔

۴۔ مرید ہے، یعنی صاحب ارادہ ہے اور اپنے کاموں میں مجبور نہیں ہے جو کام بھی انجام دیتا ہے اس کا کوئی مقصد اور فلسفہ ہوتا ہے اور زمین و آسمان میں کوئی بھی چیز فلسفہ اور مقصد کے بغیر نہیں ہے۔

۵۔ خداوند متعال مرک ہے، یعنی تمام چیزوں کو درک کرتا ہے، تمام چیزوں کو دیکھتا ہے، تمام آوازوں کو سنتا ہے اور تمام چیزوں سے آگاہ و باخبر ہے

۶۔ خداوند متعال قدیم اور از لی ہے، یعنی ہمیشہ تھا اور اس کے وجود کا کوئی آغاز نہیں ہے، کیونکہ اس کی ہستی اسی کی ذات کے اندر سے البتی ہے، اسی وجہ سے ابدی اور جاودا نی بھی ہے۔ اس لئے کہ جس کی ہستی اس کی ذاتی ہو اس کے لئے فنا اور نابودی کوئی معنی رکھتی۔

۷۔ خداوند متعال متکلم ہے، آواز کی لہروں کو ہو ایں ایجاد کر سکتا ہے تاکہ اپنے انبیاء و مرسلین سے بات کرے، نہیں کہ خداوند متعال زبان، ہونٹ اور گلارکھتا ہے۔

۸۔ خداوند متعال صادق ہے، یعنی جو کچھ کہتا ہے سچ اور عین حقیقت ہے، کیونکہ جھوٹ بولنا یا جھل و نادانی کی وجہ سے ہوتا ہے یا ضعیف و ناتوانی کی وجہ سے، چونکہ خداوند متعال عالم اور قادر ہے اس لئے محال ہے کہ وہ جھوٹ بولے۔

خدا کی مشہور ترین صفات سلبیہ۔

خداوند متعال کی معروف ترین سلبی صفات مندرجہ میں شعر میں ملاحظہ فرمائیں:

نہ مرکب بودو جسم، نہ مرئی نہ محل بی شریک است و معانی، تو غنی دان خالق

۹۔ وہ مرکب نہیں ہے۔ یعنی اس کے اجزاء ترکیبی نہیں ہیں، کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے اجزاء کی احتیاج پیدا کرتا، جبکہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔

۱۰۔ خداوند متعال جسم نہیں ہے، کیونکہ ہر جسم محدود، متغیر اور نابودی کے قابل ہوتا ہے۔

۱۱۔ خداوند متعال مرئی نہیں ہے یعنی دکھائی نہیں دیتا، کیونکہ اگر وہ دکھائی دیتا تو جسم ہوتا اور محدود اور قابل فنا ہوتا۔

- ۴۔ خداوند متعال کوئی محل نہیں رکھتا ہے، کیونکہ وہ جسم نہیں ہے تاکہ اسے محل کی ضرورت پڑے۔
- ۵۔ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کا شریک ہوتا تو اسے ایک محدود موجود ہونا چاہئے تھا، چونکہ دل احمد دود موجودات ہر جہت سے ناممکن ہیں، اس کے علاوہ اس دنیا کے قوانین کی وحدت اس کی وحدانیت کی علامت ہے۔
- ۶۔ خداوند متعال کے معانی نہیں ہیں، کیونکہ اس کی صفات اس کی عین ذات ہیں۔
- ۷۔ خداوند متعال محتاج اور نیاز مند نہیں ہے، بلکہ غنی اور بے نیاز ہے، کیونکہ علم و قدرت اور ہر چیز کے لحاظ سے ایک لا محدود وجود، کسی قسم کی کوئی کمی نہیں رکھتا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

(لیس کمشد شیء) (سورہ سورہ آیت ۱۱)

”اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔“

غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ کیا خدا کی وحدانیت اور اس کے لاثریک ہونے کے بارے میں آپ کے پاس کوئی اور دلیل موجود ہے؟
- ۲۔ کیا آپ نے سنائے کہ بعض مذاہب میں خداوں اور بعض دو خداوں کے قائل ہیں؟ یہ کون سے مذاہب ہیں؟

عدل الہی

کے

دس سبق

## پہلا سبق

عدل کیا ہے؟

۰ خدا کی صفات میں سے صرف عدل کو اصول دین کا جزو کیوں قرار دیا گیا ہے؟

۰ ”عدالت“ اور ”مساوات“ کے درمیان فرق

۱۔ تمام صفات الٰی سے کیوں صرف عدل کو چنگیا ہے؟

اس بحث میں دوسری چیزوں سے پہلے یہ نکتہ واضح ہونا چاہئے کہ عدالت کو جو کہ صفات خدا میں سے ایک صفت ہے، بڑے علماء نے دین اصول کے پنجگانہ میں سے ایک اصل کے طور پر کیوں منتخب کیا ہے؟

خداؤند متعال عالم ہے، قادر ہے، عادل ہے، حکیم ہے، رحمان و رحمی اور اذلی و ابدی ہے، خالق و رازق ہے۔ ان تمام صفات میں سے کیوں صرف عدالت کا انتخاب کیا گیا ہے اور اسی کو دین کے پنجگانہ اصول میں سے ایک قرار دیا گیا ہے؟

اس سوال کے جواب کے سلسلہ میں چند مطالب کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

۱۔ خداوند متعال کی صفات میں عدالت کو ایک ایسی اہمیت حاصل ہے کہ بہت سی دوسری صفات اس کی طرف پہنچتی ہیں، کیونکہ ”عدالت“ اپنے وسیع معنی میں ہر ایک چیز کو اپنی جگہ پر قرار دینا ہے۔ اس صورت میں حکیم، رُزاق، رحمان و رحمی اور ان جیسی دوسری صفات اس پر منطبق ہوتی ہیں۔

۲۔ معاد کا مسئلہ بھی ”عدل الٰی“ پر مختص ہے۔ انبیاء و مرسیین کی نبوت و رسالت اور انہم کی امامت بھی عدل الٰی سے مر بوظ ہیں۔

۳۔ اسلام کی ابتداء میں عدل الٰی کے مسئلہ پر کچھ اختلافات رونما ہوئے:

سنی مسمانوں کا ایک گروہ جنہیں ”اشاعرہ“ کہتے تھے، عدل الٰی کے بالکل متنزل ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ خدا کے بارے میں عدل و ظلم کوئی مفہوم نہیں رکھتا ہے۔ پوری کائنات اس کی ملک ہے اور اس سے متعلق ہے، وہ جو بھی کام انجام دے وہی عین عدالت ہے۔ یہاں تک کہ وہ حسن و فیض عقلی کے بھی قائل نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہماری عقل اکیلے ہی برے اور بھلے کو درک نہیں کر سکتی ہے، یہاں تک کہ نیکی کرنے کی خوبی اور ظلم کی بدی کو بھی درک نہیں کر سکتی ہے (وہ اس فرض کے بہت سے مغالطے سے دوچار تھے)

اہل سنت کا ایک دوسرا گروہ جنہیں ”معزلہ“ کہتے تھے اور تمام ”شیعہ“ پروردگار عالم کے بارے میں عدالت کے اصول کے قائل تھے اور کہتے تھے وہ ہر گز ظلم و ستم نہیں کرتا ہے۔

ان دو گروہوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لئے دوسرے گروہ کا نام ”عدلیہ“ رکھا گیا، جو عدل الٰی کو اپنے مکتب کی علامت کے عنوان سے

اصول دین کا جزو سمجھتے تھے اور پہلے گروہ کا نام ”غیر عدالیہ“، رکھا گیا، شیعہ ”عدالیہ“، گروہ میں شمار ہوتے تھے۔  
شیعوں نے دوسرے تمام عدالیہ سے اپنے آپ کو مشخص کرنے کے لئے ”امامت“ کو بھی اصول دین کا جزو قرار دیا۔  
المذاجہاں کبھی بھی ”عدل“ و ”امامت“ کی بات ہو وہ ”شیعہ امامیہ“ کی پیچان ہے۔

۳۔ چونکہ فروع دین ہمیشہ اصول دین کا ایک پرتو ہے اور عدالت الٰہی کا اثر انسانی معاشروں میں غیر معمولی طور پر مؤثر ہے اور انسانی معاشرے کی اہم ترین بنیاد بھی اجتماعی عدالت پر منحصر ہے، اس لئے عدالت کو اصول دین کے ایک جزو کے طور پر چن لینا ایک ایسا راز ہے جو انسانی معاشرے میں عدل کو زندہ کر نے اور ہر قسم کے ظلم و ستم سے مقابلہ کرنے کا سبب بتتا ہے۔

جس طرح پروردگار کی توحید ذات و صفات اور اس کی عبادت و پرستش کی توحید انسانی معاشرے میں وحدت و تکہی اور اتحاد کا نور ہے اور توحید صفوں کو تقویت بخشتی ہے، اسی طرح انیاء اور انہم کی رہبری بھی انسانی معاشرے میں ”سچی (عادلانہ) رہبری“، ”امثلۃ القاکریتی“ ہے۔ اس لئے پوری کائنات پر حاکم پروردگار کی عدالت کی اصل انسانی معاشرے کے تمام موقع میں عدالت کی ضرورت کی طرف ایک اشارہ و راز ہے۔

عقلیم عالم خلقت عدالت پر برقرار ہے۔ انسانی معاشرہ بھی اس کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا ہے۔

۲۔ عدالت کیا ہے؟

عدالت کے دو مختلف معانی ہیں:

۱۔ اس لفظ کے وسیع معنی، جیسا کہ ہم نے بیان کئے ”ہر چیز کا اپنی جگہ پر قرار پانا“ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں موزون اور متعادل ہونا ہے۔  
عدالت کے یہ معنی، پوری خلقت کائنات، عالم کے نظام، ایٹم، انسانی وجود کی بناؤث اور تمام نباتات و حیوانات میں پائے جاتے ہیں۔  
یہ وہی بات ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کی مشہور حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:  
”بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ“

”عدالت کے ذریعہ آسمان اور زمین برقرار ہیں“

مثال کے طور پر اگر زمین کے قوائے ”جاذبہ“ و ”دافعہ“ اپنے توازن کو کھو دیں اور ان میں سے ایک دوسرے پر غالبہ پا جائے تو زمین، یاسورج کی طرف جذب ہو جائے گی، اس میں آگ لگ جائے گی اور نابود ہو جائے گی اور یا اپنے مدار سے خارج ہو کر وسیع فضائیں آوارہ ہو کر نابود ہو جائے گی۔  
عدالت کے اسی معنی کو شاعر نے مندرجہ ذیل مشہور اشعار میں بیان کیا ہے:

عدل چبود؟ وضع اندر موضع ظلم چبود؟ وضع درنا موضع

عدل چبود؟ آب دہ اشجار اظلم چبود؟ آب دادن خارا

عدل کیا ہے؟ ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا۔ ظلم کیا ہے؟ چیز کو اس جگہ پر نہ رکھنا۔

عدل کیا ہے؟ ذر ختوں کو پانی دینا ظلم کیا ہے؟ کانٹوں کو پانی دینا۔

واضح ہے کہ پھولوں کے پودے یا میوه دار درخت کی آبیاری کی جائے تو یہ اس کا صحیح استعمال ہے اور عین عدالت ہے۔ اگر بیکار گھاس پھوس یا کانٹوں کی

آبیاری کی جائے تو یہ اس کا صحیح استعمال نہیں ہے اور عین ظلم ہے۔

۲۔ عدالت کے دوسرے معنی ”افراد کے حقوق کی رعایت کرنا“ ہیں اور اس کا مخالف ”ظلم“ یعنی دوسروں کا حق چھین کر اپنے لئے مخصوص کرنا، یا کسی کا حق چھین کر دوسرے کو دینا یا تفریق کا قائل ہونا ہے، اس صورت میں کہ بعض کو ان کا حق ادا کریں اور بعض کو ان کا حق ادا نہ کریں۔ واضح ہے کہ دوسرے معنی ”خاص“ اور پہلے معنی ”عام“ ہیں قابل توجہ بات ہے کہ ”عدل“ کے دونوں معانی خداوند متعال کے بارے میں صحیح ہیں اگرچہ ان مباحث میں زیادہ تر دوسرے معنی مقصود ہیں۔

عدل الٰہی کے معنی یہ ہیں کہ خداوند متعال نہ کسی کا حق چھینتا ہے اور نہ کسی کا حق کسی دوسرے کو دینا ہے اور نہ افراد کے درمیان امتیاز برتا ہے، وہ ہر لحاظ سے عادل ہے۔ اس کی عدالت کے دلائل سے اگلی بحث میں آگاہ ہوں گے۔

”ظلم“ کسی کا حق چھیننے کے معنی میں ہو یا کسی کا حق کسی دوسرے کو دینے کے معنی میں یا تفریق و زیادتی کی صورت میں، خدا کی ذات کے بارے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

وہ ہر گز نیک انسان کو سزا نہیں دیتا ہے اور بُرے انسان کی تشویق نہیں کرتا ہے۔ کسی سے دوسرے کے گناہ پر مواغذہ نہیں کرتا ہے اور بُرے اور بھلے سے ایک ہی قسم کا برخاؤ نہیں کرتا ہے۔

یہاں تک کہ اگر ایک بڑے معاشرے میں ایک شخص کے علاوہ سب گناہ گار ہوں تو خداوند متعال اس ایک شخص کے حساب کو دوسروں سے جدا کرتا ہے اور اسے

گناہ گاروں کے ساتھ سزا میں شامل نہیں کرتا ہے۔

یہ جو ”اشاعرہ“ کی جماعت نے کہا ہے کہ ”اگر خدا تمام انبیاء کو جہنم میں ڈال دے اور تمام بدکاروں اور ظالموں کو بہشت میں ڈال دے، تو یہ ظلم نہیں ہے“ یہ ایک بیہودہ، ناشاستہ، شرم ناک اور بے نیاد بات ہے، جس شخص کی بھی عقل خرافات اور تھسب سے آلوہ نہ ہو گی وہ اس بات کے فتح کی گواہی دے گا۔

۳۔ مساوات اور عدالت میں فرق۔

ایک اور اہم نکتہ، جس کی طرف اس بحث میں اشارہ کرنا ضروری ہے، یہ ہے کہ بعض اوقات ”عدالت“ کا ”مساوات“ سے مغالطہ کیا جاتا ہے اور تصور کیا جاتا ہے کہ عدالت کے معنی یہ ہیں کہ مساوات کی رعایت کی جائے، جبکہ ایسا نہیں ہے۔ عدالت میں ہر گز مساوات شرط نہیں ہے بلکہ حق اور ترجیحات کو مد نظر کھانا چاہئے۔

مثال کے طور پر ایک جماعت کے شاگروں میں عدالت یہ نہیں ہے کہ سب کو مساوی نمبر دئے جائیں اور دو مزدوروں کے درمیان یہ عدالت نہیں ہے کہ دونوں کو مساوی مزدوری دی جائے۔ بلکہ عدالت یہ ہے کہ ہر شاگرد کو اس کی لیاقت اور صلاحیت کے مطابق نمبر دئے جائیں اور ہر مزدور کو اس کی محنت کے مطابق مزدوری دی جائے۔

عالم فطرت میں بھی و سیع معنی میں عدالت کا مفہوم یہی ہے۔ اگر ایک وہیل چھلکی کا دل جس کا وزن تقریباً ایک ٹن ہوتا ہے، ایک چڑیا کے دل کے برابر ہوتا تو یہ عدالت نہیں تھی۔ اگر ایک مضبوط لمبے درخت کی جڑ ایک چھوٹے سے پودے کی جڑ کے برابر ہو تو یہ عدالت نہیں ہے بلکہ عین ظلم ہے۔

عدالت کے معنی یہ ہیں کہ ہر مخلوق اپنے حق، استعداد اور صلاحیت کے مطابق اپنا حصہ حاصل کرے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ خدا کی تمام صفات میں سے صرف عدالت کو کیوں اصول دین کا جزو شمار کیا گیا ہے؟

۲۔ ”اشاعرہ“ کون تھے؟ ان کے عقائد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۳۔ عدل اللہ کا اعتقاد معاشرے میں کیا اثر رکھتا ہے؟

۴۔ عدالت کے کتنے معانی ہیں؟ ان کی تشریح کیجئے

۵۔ کیا عدالت مساوات کے معنی میں ہے؟

## دوسرے سبق

عدل اللہ کے دلائل

۱۔ حسن و فتح عقلی

پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہماری عقل اشیاء کی ”خوبی“ اور ” بدی“ کو قابل توجہ حد تک درک کرتی ہے۔ (یہ وہی چیز ہے، جس کا نام علماء نے ”حسن فتح عقلی“ رکھا ہے)

مثلا ہم جانتے ہیں کہ عدالت و احسان اچھی چیز ہے اور ظلم و بخل بُری چیز ہے۔ یہاں تک کہ ان کے بارے میں دین و مذہب کی طرف سے کچھ کہنے سے

پہلے بھی ہمارے لئے یہ چیز واضح تھی، اگرچہ دوسرے ایسے مسائل موجود ہیں جن کے بارے میں ہمارا علم کافی نہیں ہے اور ہمیں رہبر ان اللہی و انبیاء کی رہبری سے استفادہ کرنا چاہئے۔

اس لئے اگر ”اشاعرہ“ کے نام سے مسلمانوں کے ایک گروہ نے ”حسن فتح عقلی“ سے انکار کر کے اچھائی اور برائی کو پہچانے کا راستہ۔ حتیٰ عدالت و ظلم وغیرہ کے سلسلہ میں۔ صرف شرع و مذہب کو کافی جانا ہے، تو یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔

کیونکہ اگر ہماری عقل نیک و بد کو درک کرنے کی قدرت و صلاحیت نہ رکھتی ہو تو ہمیں کہاں سے معلوم ہو گا کہ خداوند متعال مجھہ کو ایک جھوٹے انسان کے اختیار میں نہیں دیتا ہے؟ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا بُرا اور حقیقہ ہے اور خدا سے یہ کام انجام پانامحال ہے، تو ہم جانتے ہیں کہ خدا کے وعدے سب حق ہیں اور اس کے بیانات سب پتے ہیں۔ وہ کبھی جھوٹے کی تقویت نہیں کرتا ہے اور مجھہ کو ہر گز جھوٹے کے اختیار میں نہیں سوپتا ہے۔

اسی وجہ سے شرع و مذہب میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر اعتناد کیا جا سکتا ہے۔

اس لئے ہم نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ حسن و فتح عقلی پر اعتقاد دین و مذہب کی بنیاد ہے۔ (تو جس کبھی!)

اب ہم عدل اللہی کے دلائل کی بحث شروع کرتے ہیں اور اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں جانا چاہئے:

۲۔ ظلم کا سرچشمہ کیا ہے؟

”ظلم“ کا سرچشمہ مندرجہ ذیل امور میں سے ایک ہے:

الف۔ جہل: بعض اوقات ظالم انسان حقیقت میں نہیں جانتا ہے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ نہیں جانتا ہے کہ وہ کس کی حق تلفی کرتا ہے، اور اپنے کام سے بے خبر ہے۔

ب۔ احتیاج: کبھی دوسروں کے پاس موجود چیز کی احتیاج انسان کو وسواس میں ڈالتی ہے کہ اس شیطانی کام کو انجام دے، جبکہ اگر بے نیاز ہوتا، اس قسم کے موقع پر اس کے لئے ظلم کرنے کی کوئی دلیل موجود نہ ہوتی۔

ج۔ عجز و ناتوانی: بعض اوقات انسان راضی نہیں ہوتا کہ دوسروں کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرے لیکن اس میں یہ کام انجام دینے کی قدرت و قوانین نہیں ہوتی ہے اور ناخواستہ ”ظلم“ کا مر تکب ہوتا ہے۔

د۔ خود پرستی، حسد اور انقاومی جذبہ۔ گاہی میں کوئی ایک مؤثر نہیں ہوتا ہے، لیکن ”خود پرستی“، اس امر کا سبب بنتی ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق کو پائماں کرے۔ یا ”انقاومی جذبہ“ اور ”کینہ و حسد“ اسے ظلم و ستم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یا کبھی ”اجارہ داری“ دوسروں کی حق تلفی کا سبب بن جاتی ہے... اور ان کے مانند دوسرے عوامل و اسباب۔

لیکن چونکہ مذکورہ بڑی صفات اور عیوب و نقصائص میں سے کوئی چیز خداوند متعال کے وجود مقدس میں نہیں پائی جاتی، وہ ہر چیز کا عالم، سب سے بے نیاز، ہر چیز پر قادر اور ہر ایک کے بارے میں مہربان ہے، اس لئے اس کے لئے ظلم کا مر تکب ہونا معنی نہیں رکھتا ہے۔

اس کا وجود بے انتہا اور کمال لا محود ہے، ایسے وجود سے خیر، نیکی، عدل و انصاف، مہربانی اور رحمت کے علاوہ کوئی چیز صادر نہیں ہوتی ہے۔

اگر وہ بد کاروں کو سزا دیتا ہے تو وہ حقیقت میں ان کے کرتلوں کا نتیجہ ہوتا ہے، جو انھیں ملتا ہے، اس شخص کے مانند جو نشہ آور چیزیں یا ثواب پیٹنے کے نتیجہ میں مہلک بیماریوں میں متلا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

(حل تجرون إلماً كنتم تعلمون) (سورہ نمل، ۹۰)

”کیا تمھیں تمھارے اعمال کے علاوہ بھی کوئی معادضہ دیا جا سکتا ہے۔“

### ۳۔ قرآن مجید اور عدل الٰی

قابل توجہ بات ہے کہ قرآن مجید میں اس مسئلہ کے بارے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔

ایک جگہ پر فرماتا ہے:

(إِنَّ الْمُسْلِمَ يُظْلَمُ إِنَّ النَّاسَ شَيْءًا لِكُنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يُظْلَمُونَ)

(سورہ یونس، ۳۲)

”اللہ انسانوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے بلکہ انسان خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا کرتے ہیں۔“

ایک دوسری جگہ پر فرماتا ہے:

(إِنَّ الْمُسْلِمَ يُظْلَمُ مُشْقًا لَذَرْرَةٍ (...)

”اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے۔“

روز قیامت کے حساب اور جزا کے بارے میں فرماتا ہے:

(وَنَصْعَدُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَلِيَّةَ فَلَا تَظْلَمُنَا نَفْسٌ شَيْئًا) (سورہ نبیا، ۷۳)

”اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو و قائم کریں گے اور کسی نفس پر ادنیٰ ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

(قابل توجہ بات ہے کہ یہاں پر ”میزان“ سے مقصود نیک و بد کو تو لئے کا و سیلہ ہے نہ اس دنیا کے مانند کوئی ترازو)

### ۴۔ عدل و انصاف کی دعوت

ہم نے کہا کہ انسان کی صفات، خداوند متعال کی صفات کا ایک پرتو ہونا چاہیئیں تاکہ انسانی معاشرے میں الٰہی صفات کا نور پھیلے۔ اسی اصول کی بنیاد پر جس

قدر قرآن مجید عدل الٰہی کو بیان کرتا ہے، اسی قدر انسانی معاشرے اور ہر انسان میں عدل و انصاف قائم کرنے پر اہمیت دیتا ہے۔ قرآن مجید بار بار ظلم کو

معاشروں کی تباہی و بر بادی کا سبب بتاتا ہے اور ظالموں کے انجام کو دردناک ترین انجام شمار کرتا ہے۔

قرآن مجید گزشتہ اقوام کی داستان بیان کرنے کے ضمن میں بار بار اس حقیقت کی یاد دہانی کرتا ہے کہ دیکھو ظلم و فساد کے نتیجے میں کس طرح وہ اقوام

عذاب الٰہی سے دوچار ہو کر نابود ہوئے، تم بھی اس سے ڈرو کہ کہیں ظلم کرنے کے نتیجے میں اس قسم کے انجام سے دوچار نہ ہو جاؤ۔

قرآن مجید واضح الفاظ میں ایک بنیادی اصول کے عنوان سے کہتا ہے:

(إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الرِّثَاءِ وَيَنْهَا عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْمُنْجَنِي) (سورہ نحل، ۹۰)

”بیشک اللہ عدل، احسان اور قربابت داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے اور بد کاری، ناشائستہ حرکات اور ظلم سے منع کرتا ہے۔“

قابل توجہ بات ہے کہ جس طرح ظلم کرنا ایک بر اور فتح کام ہے، اسی طرح ظلم کو برداشت کرنا بھی اسلام اور قرآن کی نظر میں غلط ہے، چنانچہ سورہ بقرہ

کی آیت نمبر ۲۷ میں آیا ہے:

”لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ“ (سورہ بقرہ ۲۹، ۳۰)

”نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے“

اصولی طور پر ظلم کو قبول کرنا ظلم کی حوصلہ افرائی، اس کی تقویت اور ظالم کی مدد کرنے کا باعث ہے۔

### غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ کیا ہماری عقل برادرست اور شرع کے بغیر نیکی اور بدی کو درک کر سکتی ہے؟

۲۔ ظلم کمن امور سے صادر ہوتا ہے؟ عدل اللہ کی عقلی دلیل کیا ہے؟

۳۔ عدل اللہ اور خدا کی ذات مقدس سے ظلم کی نفی کے بارے میں قرآن مجید کیا کہتا ہے؟

۴۔ عدالت اور ظلم کے مقابلہ میں انسان کی کیا ذمہ داری ہے؟

۵۔ کیا ظلم کو قبول کرنا اور ظلم و ستم کو برداشت کرنا بھی گناہ ہے؟

## تیسرا سبق

آفات و بلیات کا فلسفہ (۱)

قدیم زمانہ سے آج تک ایک نااگاہ گروہ نے عدل اللہ پر نکتہ چینی کی ہے اور ایسے مسائل پیش کئے ہیں جو ان کے اعتقاد کے مطابق عدل اللہ سے سازگار نہیں ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات نہ صرف ان مسائل کو عدل اللہ کی نفی کی دلیل بلکہ انھیں وجود خدا کے انکار کی دلیل سمجھے ہیں! من جملہ ان کے ناگوار حادث کا وجود، جیسے طوفان، زلزلہ اور دوسరے عام مصائب۔ اسی طرح وہ فرق جو مختلف انسانوں میں پایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ انسان، بیات اور دوسرا مخلوقات کو پیش آنے والی مصیبتوں اور آفتین۔ یہ بحث، کبھی ماہ پرستوں کے مقابلہ میں معرفت خدا کی بحث میں پیش کی جاتی ہے اور کبھی عدل اللہ کی بحث میں، ہم اسے اس بحث میں پیش کرتے ہیں۔ یہ جانے کے لئے کہ، دقيق تجربی کے نتیجہ میں یہ تصور کس حد تک غلط ہے، اس موضوع پر ایک مفصل بحث اور مندرجہ ذیل مطالب کی دقيق کی تحقیق ضرورت ہے:

۱۔ محدود معلومات اور حالات کے زیر اثر فیصلے عام طور پر ہم اپنے فیصلوں اور مصادیق کی تشخیص میں مختلف اشیاء کے اپنے ساتھ رابطہ پر تکیہ کرتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں فلاں چیز دوڑ رہے یا نزدیک یعنی ہماری نسبت۔

یافلاں شخص طاقتور ہے یا کمزور، یعنی ہماری روحی یا جسمی حالت کی نسبت اس کی حالت ایسی ہے۔ خیر و شر اور مصیبت و بلا کے بارے میں بھی لوگوں کے فیصلے اکثر اسی طرح کے ہوتے ہیں۔

مثلاً گرسی علاقہ میں وسیع پیانے پر بارش برے، ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے کہ اس بارش کے مجموعی اثرات کیسے تھے، ہم صرف اپنی زندگی، گھر اور کھیت یا زیادہ سے زیادہ اپنے شہر کی حد تک نظر ڈالتے ہیں، اگر اس کا ثابت اثر تھا تو کہتے ہیں یہ نعمت اللہ تھی، اگر منفی تھا تو اسے ”بلا“ کہتے ہیں۔ جب ایک پرانی اور فرسودہ عمارت کوئئے سرے سے تعمیر کرنے کے لئے گراتے ہیں اور ہم پر وہاں سے گزرتے ہوئے اس کے گرد و غبار پڑتے ہیں تو کہتے ہیں: کیسا براحدا شہ ہے، اگرچہ آئندہ وہاں پر ہسپتال ہی کیوں نہ تعمیر ہوا اور دوسرا لوگ اس سے مستفید ہوں اور بارش کی مثال میں اگرچہ مجموعی طور پر علاقہ کے لئے ثابت اثرات ظاہر ہوں۔

ہم سطحی اور عام طور پر سانپ کے ڈنے کو ایک مصیبت اور شر سمجھتے ہیں۔ ہم اس سے غافل ہیں کہ بھی ڈسنا اور زہر اس حیوان کے لئے دفاع کا ایک موثر وسیلہ ہے اور ہم اس سے بے خبر ہیں کہ گاہے اسی زہر سے حیات بخش دوائی بنائی جاتی ہے جو ہزاروں انسانوں کو موت سے نجات دیتی ہے۔

اس لئے اگر ہم مغالطہ سے بچنا چاہیں تو ہمیں اپنی محدود معلومات پر نظر ڈالنی چاہئے اور فیصلہ کرتے وقت صرف اشیاء کے اپنے ساتھ روابط کو مد نظر نہیں رکھنا چاہئے بلکہ ہمیں تمام جہتوں کو مد نظر رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے۔

بنیادی طور پر دنیا کے حادث زنجیر کی کڑیوں کے مانند آپس میں ملے ہوئے ہیں: آج، ہمارے شہر میں آنے والا طوفان اور سیالب لانے والی بارش کا بر سنا اس طوالی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو دوسرے حادث کے ساتھ مکمل طور پر مربوط ہے اسی طرح یہ ماضی میں رونما ہوئے اور مستقبل میں رونما ہونے والے حادث سے جڑے ہوئے ہیں۔

نتیجہ کے طور پر حادث کے ایک چھوٹے حصہ پر انگلی رکھ کر اس کے بارے میں فیصلہ کرنا منطق اور عقل کے مطابق نہیں ہے۔ قابل انکار چیز صرف مطلق شر کی خلقت ہے۔ لیکن اگر کوئی چیز کسی جہت سے خیر اور کسی جہت سے شر ہو اور اس کا خیر غلبہ رکھتا ہو تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ ایک آپریشن کچھ جہات سے تکلیف دہ اور زیادہ تر جہات سے مفید ہے، اس لئے نسبتاً خیر ہے۔

پھر مزیدوضاحت کے لئے زلزلہ کی مثال پر غور کیا جا سکتا ہے: صحیح ہے کہ ایک جگہ پر زلزلہ ویرانی اور تباہی لاتا ہے۔ لیکن اگر ہم دوسرے مسائل سے اس کے سلسلہ وار روابط کو مد نظر رکھیں تو ممکن ہے ہمارا فیصلہ بدلت جائے۔

اس سلسلہ میں سائنسدانوں کے مختلف نظریات ہیں کہ زلزلہ زمین کی اندر ورنی گرمی اور بھاپ سے مربوط ہے یا چاند کی قوت جاذبہ سے مربوط ہے جو زمین کی خشک وجامد سطح کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور کبھی اسے توڑ دیتا ہے، یادوں چیزوں سے مربوط ہے؟

لیکن مذکورہ عوامل میں سے جو بھی ہو، اس کے آثار کو مد نظر رکھنا چاہئے۔ یعنی ہمیں جانتا چاہئے کہ زمین کی اندر ورنی گرمی، زمین کے اندر موجود تیل کے ذخائر اور کوئی کی کانون اور دوسری چیزوں کی تولید پر کیا اثر ڈالتی ہے؟! اس لئے یہ نسبتاً خیر ہے۔

اس کے علاوہ سمندروں کے مدد جزر، سمندروں کے پانی اور اس میں موجود جانوروں کی حفاظت اور کبھی خشک سواحل کی آبیاری میں کتنے موثر ہیں! یہ بھی نسبتاً خیر ہے۔

یہاں پر ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری سطحی فیصلے اور محدود معلومات ہیں جنہوں نے عالم خلقت کے ان امور کو تاریک کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ہم جس قدر حادث کے آپسی روابط اور پیوند کے بارے میں زیادہ غور کریں گے اس مطلب کی اہمیت کے بارے میں اتنا ہی زیادہ آگاہ ہوں گے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

(وَمَا أَوْتَمِ منَ الْعِلْمَ إِلَّا قَلِيلًا) (سورہ اسراء، ۸۵)

”اوہ تمھیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔“

امذ اس تھوڑے سے علم و دانش کے ذریعہ فیصلہ کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے۔  
۲۔ ناخوشنگوار اور انتباہ کرنے والے حادث

ہم نے ایسے افراد کو دیکھا ہے کہ جب وہ کسی نعمت میں غرق ہوتے ہیں تو ”خود خواہی اور غرور“ سے دوچار ہوتے ہیں اور اس حالت میں بہت سے اہم انسانی مسائل اور اپنے فرائض کو بھول ڈالتے ہیں۔

اور ہم سب نے یہ بھی دیکھا ہے کہ زندگی کے مکمل آرام و آسائش کی حالت میں انسان کس طرح ”خواب غفلت“ میں پڑ جاتا ہے کہ اگر انسان کی یہ

حالت جاری رہی تو وہ بد بختی سے دوچار ہو جاتا ہے۔

بیشک زندگی کے بعض ناخوشگوار حوادث انسان کو غرور و تکبر اور غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کے لئے ہیں۔

آپ نے یقیناً سننا ہو گا کہ با تجربہ اور مہر ڈرائیور صاف و ہموار اور موڑوں سے خالی سڑکوں کے بارے میں اعتراض کرتے ہیں اور اس قسم کی سڑکوں کو خطرناک جانتے ہیں، کیونکہ سڑکوں کا ہموار و یکسان ہونا ڈرائیور کے لئے خواب آور ہونے کا سبب بنتا ہے اور وہ خطرہ سے دوچار ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض ملکوں میں مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس قسم کی سڑکوں پر مصنوعی نشیب و فراز (speed breaker) سپیڈ بریکر اور موڑ بنائے جاتے ہیں تاکہ اس قسم کے خطرات کو روکا جاسکے۔

انسان کی زندگی کا راستہ بھی ایسا ہی ہے۔ اگر زندگی میں نشیب و فراز اور مشکلات نہ ہوں اور اگر کبھی کبھار ناگوار حوادث پیش نہ آئیں تو انسان کے لئے خدا، اپنے سرانجام اور اپنی ذمہ داریوں سے غفلت بر تلقینی بن جاتا ہے۔ ہم ہر گز یہ نہیں کہتے کہ انسان خود اپنے لئے ناخوشگوار حوادث ایجاد کرے اور مصیبتوں کی طرف بڑھے، کیونکہ انسان کی زندگی میں یہ امور ہمیشہ سے تھے اور ہیں گے، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اسے توجہ کرنی چاہئے کہ ان حوادث میں سے بعض کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کے غرور و غفلت کے لئے رکاوٹ بنیں کیونکہ یہ چیزیں اس کی سعادت و خوشبختی کی دشمن ہیں۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ فلسفہ بعض ناخوشگوار حوادث سے متعلق ہے، نہ کہ تمام حوادث سے متعلق۔ باقی حصہ کے بارے میں انشا اللہ بعد میں بحث کریں گے۔

اس سلسلہ میں ہماری عظیم آسمانی کتاب قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

(فَاخْذُوهُمْ بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقَرَّبُونَ )

(سورہ انعام، ۳۲)

”اس کے بعد انھیں سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا کہ شاید ہم سے گڑ گڑائیں۔“

## غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ کن لوگوں نے آفات و مصائب کے مسئلہ کو عقائد میں شامل کیا ہے؟
- ۲۔ آفات و مصائب کے کچھ نمونے بیان کیجئے، کیا آپ اپنی زندگی میں کبھی ان سے دوچار ہوئے ہیں؟
- ۳۔ شبتوں اور ہمہ جہت فیصلہ اور ”شر مطلق“، ”خیر مطلق“ کیا ہے؟
- ۴۔ کیا طوفان اور زلزلے یقیناً اقصان دہ ہیں؟
- ۵۔ ناخوٹگوار حادث انسان کی زندگی میں کونے ثبت نفسیاتی اثرات ڈال سکتے ہیں؟

## چوتھا سبق

آفات و بلیات کا فلسفہ (۲)

ہم نے کہا کہ انسانی زندگی میں رونما ہونے والے ناخوٹگوار حادث، آفات، مشکلات اور ناکامیوں پر اعتراض کرنے والوں نے ان چیزوں کو عدل الٰہی سے انکار کرنے کا بہانہ قرار دیا ہے بلکہ بعض اوقات اسی بہانہ سے پروردگار کے وجود کے بھی متنکر بن گئے ہیں!

گزشته بحث میں ہم نے ان حوادث کے ایک حصہ پر بحث و تحقیق کی اور اس کے دو فلسفوں کی وضاحت کی۔ یہاں پر ہم اسی بحث کو جاری رکھتے ہیں۔

### ۳۔ انسان مشکلات میں پرورش پاتا ہے

ہم پھر یہ بات کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے ہاتھوں اپنے لئے مشکلات اور حادث ایجاد نہیں کرنے چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے موقع پر سخت اور ناخوگوار حادث اور مشکلات ہمارے ارادہ کو تفہیت بخشنے کا سبب بنتے ہیں، جس طرح لوہا بھٹی میں ڈال کر گرم کیا جاتا ہے اور وہ سرد و گرم جھیل کر پائدار ہو جاتا ہے، اسی طرح ہم بھی حادث کی بھٹی میں سرد و گرم زمانہ جھیل کر پختہ اور قوی بن جاتے ہیں۔

جنگ ایک بڑی چیز ہے، لیکن کبھی ایک سخت اور طولانی جنگ ایک ملت کی استعداد کو وسعت پختہ ہے، اختلافات کو اتحاد و پیختہ میں تبدیل کرتی ہے اور پسمند گیوں کی تیزی کے ساتھ تلاñی کرتی ہے۔

ایک معروف مغربی مورخ کہتا ہے: ”پوری تاریخ میں دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہر نمایاں تہذیب کا ظہور، ایک ملک پر کسی بیر و نی بڑی طاقت کے حملہ کے بعد رونما ہوتا ہے اور یہی بیر و نی حملہ اس ملک کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کر کے انھیں منسجم و متعدد کر دیتا ہے۔“

لیکن زندگی کے تلخ حادث کے مقابلہ میں ہر فرد اور ہر معاشرہ کا رد عمل یکساں نہیں ہوتا ہے۔ بعض لوگ ان حادث کے مقابلہ میں یاس و نامیدی اور ضعف و بد نظری کے شکار ہو جاتے ہیں اور مخفی نتیجہ حاصل کرتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے پاس مناسب وسائل موجود ہوتے ہیں، وہ ان حادث کے مقابلہ میں جوش و جذبہ سے حرکت میں آ جاتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کی تیزی کے ساتھ اصلاح کرتے ہیں۔

چونکہ ایسے موقع پر اکثر لوگ سطحی فیصلہ کرتے ہیں اور صرف مشکلات اور سختیوں کو دیکھتے ہیں اس لئے وہاں کے ثابت اور تعمیری آثار کو نہیں دیکھ پاتے۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے تمام تلخ حادث کے ایسے ہی اثرات ہوتے ہیں، لیکن کم از کم ان میں سے بعض ایسے ہی ہیں۔

اگر آپ دنیا کے غیر معمولی انسانوں کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو جائے گا تقریباً وہ سب مشکلات اور سختیوں میں پلے ہیں، ایسے بہت کم لوگ پائے جاتے ہیں، جو عیش و عشرت میں پلے ہوں اور غیر معمولی شخصیت بن کر شہرت پائے ہوں۔ فوج کے کمانڈروں وہ بنتے ہیں جو سخت اور طولانی میدان کار زار میں اپنے جو ہر دکھاتے ہیں۔ عظیم اقتصادی وہ ہوتے ہیں جو بحران زدہ اقتصادی بازاروں میں گرفتار ہے ہیں۔

بڑے اور قدر تمند سیاست دان وہ ہوتے ہیں جو اپنی سیاسی تحریک میں مشکلات سے مقابلہ کرتے ہیں اور سختیاں جھیلتے ہیں۔

محض یہ کہ انسان مشکلات اور سختیوں کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔

ہم قرآن مجید میں یوں پڑھتے ہیں:

(فعیل ان تکر ھوا شیلکو یجبل السدیفیہ خیر اکشیر ۱۰)

(سورہ نساء، ۱۹)

”ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور خدا اسی میں خیر کشیر قرار دے۔“

### ۴۔ مشکلات خدا کی طرف پہنچنے کا سبب ہیں

ہم نے گزشته بخشوں میں پڑھا کہ ہمارے وجود کے ہر ایک حصہ کا ایک مقصد ہے۔ آنکھ ایک مقصد کے لئے ہے، کان ایک دوسرے مقصد کے لئے

، دل، دماغ اور اعصاب میں سے ہر ایک کسی نہ کسی مقصد کے لئے پیدا کرنے گے ہیں، یہاں تک کہ ہماری انگلیوں کی لکیروں میں بھی ایک فلسفہ مضر ہے۔  
اس بنابر کیسے ممکن ہے کہ ہمارا پورا وجود مقصد اور فلسفہ کے بغیر ہو؟

ہمیں گزشتہ بحثوں میں معلوم ہوا کہ یہ مقصد، انسان کے تمام جہتوں میں تکامل حاصل کرنے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے۔

اس تکامل تک پہنچنے کے لئے یقیناً، تعلیم و تربیت کے ایک ایسے عین نظام کی ضرورت ہے جو انسان کے پورے وجود پر حاوی ہے۔ اسی لئے خداوند متعال نے انسان کو پاک توحیدی فطرت عطا کرنے کے علاوہ عظیم انبیاء کو آسمانی کتابوں کے ساتھ بھیجا تاکہ اس راہ میں انسان کی رہبری کی ذمہ داری نجاتیں۔  
اس کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ کبھی کبھی انسان کو اس کے گناہوں اور خطاؤں کا رد عمل دکھایا جائے اور خدا کی نافرمانی کے نتیجہ میں وہ اپنی زندگی میں مشکلات سے دوچار ہوتا کہ اپنے برے اعمال کے نتائج سے آگاہ ہو کر خدا کی طرف پلٹ آئے۔ ایسے ہی موقع پر بعض بلا کم اور ناخوشگوار حادث رحمت و نعمت الٰہی ہوتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید یاد ہانی کرتا ہے:

(ظہر الفساد فی لبرٰ واحدہ ما کسبت ایدی النّاس لیذٰ یقّہم بعض الذّنی عملوا علّهٰ یر جعون )

(سورہ روم، ۲۱)

”لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی بنابر فساد خشکی اور تری ہر جگہ غالب آگیا ہے تاکہ خدا ان کے کچھ اعمال کا مزہ چکھا دے تو شاید یہ لوگ پلٹ کر راستے پر آ جائیں۔“

ذکورہ بیان کے پیش نظر در دنیا ک حادث کو ”شر“ کا مصدق اجاتا، اخیں ”بلاعین“، ”کہنا، اور اخیں عدل الٰہی کے خلاف سمجھنا عقل و منطق کے خلاف ہے، کیونکہ جتنا ہم اس مسئلہ میں عین ترغیب کریں گے زیادہ سے زیادہ اس کے اسرار اور موزے آگاہ ہوں گے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ ہماری خلقت کا مقصد کیا ہے؟ اس مقصد تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے؟
- ۲۔ انسان مشکلات کا مقابلہ کر کے کیسے سیسیہ پلاٹی ہوئی دیوار کے ماند قوی بن سکتا ہے؟
- ۳۔ کیا آپ نے ایسے افراد کو دیکھا ہے یا تاریخ میں پڑھا ہے جو مشکلات اور سختیوں سے مقابلہ کرنے کے نتیجہ میں عظیم مرتبہ پرفائر ہو چکے ہوں؟ ان کے حالات زندگی بیان کیجئے۔
- ۴۔ ہمارے گناہوں کے رد عمل کے بارے میں قرآن مجید کیا فرماتا ہے؟
- ۵۔ تلخ اور ناخوشگوار حوادث سے کون لوگ ثابت نتیجہ حاصل کرتے ہیں اور کون لوگ منفی نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟

## پہنچوں سبق

آفات و بلیات کا فلسفہ (۳)

چونکہ خدا کی معرفت اور توحید کے مباحث کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ناخوشگوار آفات و حوادث کی مشکل ایک قابل غور مشکل ہے، اس لئے ہم آفات و حوادث کے بارے میں مزید فلسفوں کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں، لہذا اس بحث کو آگے بڑھاتے ہیں۔

۵۔ مشکلات اور نشیب و فراز زندگی کو روشن کیجئے۔  
شاید بعض افراد کے لئے اس مسئلہ کا دراک مشکل ہو گا کہ اگر خدا کی نعمتوں کا سلسلہ جاری اور یکساں ہو تو وہ اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔ آج ثابت ہو چکا ہے کہ اگر ایک جسم کو ایک کمرہ کے پیچے میں رکھا جائے اور اسپر ہر طرف سے یکساں اور تیز روشنی ڈالی جائے اور خود جسم اور کمرہ بھی مکمل طور پر شفاف اور گول ہوں، تو اس جسم کو ہر گز دیکھا نہیں جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہمیشہ جب روشنی کے کنارے سامنے قرار پاتے ہیں تو وہ جسم کے ابعاد کو مشخص کرتے ہیں اور اسے اپنے اطراف سے جدا کرتے ہیں اور ہم اسے دیکھ سکتے ہیں۔

زندگی کی نعمتوں کی قدر و قیمت بھی مشکلات کے پرزنگ اور کمرنگ سایوں کے بغیر قبل مشاہدہ نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص زندگی بھر کبھی بیمار نہ ہو تو وہ ہر

گز صحبت و سلامتی کے مزہ کا احساس نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ایک رات کو شدید بخار اور سر درد میں بیٹلا ہو جائے اور صبح ہونے پر وہ اس بخار اور سر درد سے نجات پا جائے تو صحبت و سلامتی کا مزہ اس کے ذائقہ کو اس قدر شیرین کرتا ہے کہ جب کبھی اسے اس بخار اور المناک رات کی یاد آتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس صحبت و سلامتی نام کا کون سائیمپتی گوہر ہے۔

یکساں زندگی۔ حتی خوشحال ترین زندگی۔ بالکل تھکا دینے والی، بے روح اور مہلک زندگی ہوتی ہے۔ اکثر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بعض افراد خوشحال اور ہر قسم کے رنج والم سے خالی زندگی سے اس قدر تھک چکے ہیں کہ خود کشی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں یا ہمیشہ اپنی زندگی کے بارے میں گلہ شکوئے کرتے ہیں۔ آپ کسی باذوق معمدار کو پیدا نہیں کر سکتے ہیں، جو ایک بڑے ہاں کی دیواروں کو ایک زندان کی دیواروں کے مانند صاف اور یکساں تعمیر کرے، بلکہ وہ اس ہاں کی دیواروں کو لاتار چڑھاؤ اور پیچ و خم کے ساتھ تعمیر کر کے پُرکش بنادیتا ہے۔

یہ عالم طبیعت کیوں اس قدر خوبصورت ہے؟

پہاڑوں پر موجود جنگلوں کے مناظر اور چھوٹے بڑے درختوں کے بیچ میں سے مار پیچ کے مانند گزرنے والی نہریں کیوں اس قدر خوبصورت اور دل آویز ہوتی ہیں؟!

اس کی ایک واضح وجہ ان کا یکساں نہ ہونا ہے۔

”روشنی“ اور ”نیار کیلی“، اور شب و روز کی آمد و رفت کا نظام، جس کا ذکر قرآن مجید نے مختلف آیات میں کیا ہے، اس کا ایک اہم مقصد انسانوں کی یکساں زندگی کو ختم کرنا ہے، کیونکہ اگر سورج آسمان کے ایک کونے سے یکساں اور مسلسل طور پر کرہ زمین پر اپنی روشنی پھیلاتا اور نہ اپنی حالت میں تبدیلی لاتا اور نہ اس کی جگہ رات کا پردہ پڑتا، تو دوسرے مشکلات کے علاوہ، تھوڑی ہی مدت میں سب انسان تھک جاتے۔

اس وجہ سے مانا چاہئے کہ کم از کم زندگی کے بعض ناخوشنگوار حوادث اور مشکلات میں یہ فلسفہ ہے کہ یہ بقیہ زندگی کو روح بخستہ ہیں اسے شرین اور قابل برداشت بناتے ہیں، نعمتوں کی قدر و قیمت کو واضح کر دیتے ہیں اور انسانوں کے لئے یہ ممکن بناتے ہیں کہ موجودہ نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

## ۲۔ خود ساختہ مشکلات

ایک اور نکتہ، جس کی طرف ہم اس بحث کے اختتام پر اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، یہ ہے کہ بہت سے لوگ ناخوشنگوار حوادث اور مصائب کے عوامل کا محاسبہ کرنے میں بعض اوقات مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں اور ظالم انسانوں کے ذریعہ وجود میں آئے ظلم کو خلقت کے نظام کی نا انصافی جانتے ہیں اور انسان کے کام کی بد نظمی کو خلقت کی بد نظمی شمار کرتے ہیں۔

مثلاً کبھی اعتراض کرتے ہیں کہ مصیبت زدہ پر ہی کیوں مصیبتوں ٹوٹ پڑتی

ہیں؟! زلزلوں میں کیوں شہروں میں نقصانات کم ہوتے ہیں اور گاؤں میں زیادہ قربانیاں رونما ہوتی ہیں اور، بہت سے لوگ ملے میں پھنسے رہ جاتے ہیں، یہ کون انصاف ہے؟ اگر کوئی مصیبت قسم میں طے ہو تو کیوں یکساں نہیں آتی؟

دردناک حادثات سے کیوں اکثر مستضعین (کمزرو لوگ) دوچار ہوتے ہیں؟ اور وہ بائی بیماروں کے کیوں یہی لوگ زیادہ تر شکار ہوتے ہیں؟

جبکہ حقیقت میں ان میں سے کوئی بھی چیز خلقت کے نظام اور خدا کی خلقت اور عدالت سے مربوط نہیں ہے، بلکہ یہ خود انسانوں کے ایک دوسرے پر ظلم واستعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اگر گاؤں والے شہر نشینوں کے ظلم کی وجہ سے فقر و محرومیت سے دوچار نہ ہوتے اور اپنے لئے مضبوط مکانات تعمیر کر سکتے تو وہ زلزلہ میں زیادہ نقصانات سے کیوں دوچار ہوتے اور دوسرا کم؟

لیکن جب ان کے گھر معمولی مٹی، پتھر اور لکڑی کے بنے ہوں اور ان میں چونا اور سینیٹ کا نام تک نہ ہوا اور ہوا کے ایک جھونکے یا معمولی زلزلہ سے زمین بوس ہو جائیں تو انھیں اس سے بہتر حالت کی توقع نہیں کرنی چاہئے، لیکن اس کا خدا کے کام سے کیا ربط ہے؟

ہمیں اس شاعر کے مانند اعتراض نہیں کرنا چاہئے، جس نے کہا ہے:

”یکے رادا دا ی صد ناز و نعمت“

ایک کو سو نعمتیں عطا کی ہیں اور دوسرا کو غاک ذلت پر بھاد ریا ہے،

ایک کو محل کو عطا کئے ہیں اور دوسرا کو جھوپڑی!

حقیقت میں یہ اعتراض معاشرہ کے غیر عادلانہ اور غلط نظام پر کئے جانے چاہئے۔ ہمیں ان اجتماعی نافاضیوں کا خاتمہ کرنا چاہئے فقر و پسماندگی سے مقابلہ کرنا چاہئے اور مستضعفین کو ان کے حقوق دینے چاہئے تاکہ معاشرہ میں اس قسم کے حالات پیدا نہ ہونے پائیں۔

اگر معاشرہ کے تمام لوگوں کو مناسب غذا، صحت اور طیبی خدمات میں تزوہ عام بیماریوں کے مقابلہ میں مقاومت پیدا کریں گے۔

لیکن جب ایک معاشرہ کا غلط اجتماعی نظام اور اس پر حاکم استکبار ایک شخص کے لئے اس قدر وسائل فراہم کرے کہ اس کے پالتوکتے اور بیلی کے لئے بھی مخصوص ڈاکٹر متعین ہو اور اس کے مقابلہ میں دوسرا کے ایک نوزاد بچے کے لئے بھی صحت و سلامتی کے ابتدائی وسائل مہیا نہ ہوں تو اس قسم کے ناخو شگوار حالات زیادہ رونما ہوتے ہیں۔

ایسے حالات میں ہمیں خدا کے کام پر اعتراض کرنے کے بجائے خود اپنے ہی کام پر اعتراض کرنا چاہئے۔

ہمیں ظالم سے کہنا چاہئے کہ ظلم نہ کرے۔

ہمیں مظلوم سے کہنا چاہئے کہ ظلم برداشت نہ کرے!

ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ معاشرے کے ہر فرد کو کم از کم صحت و صفائی، علاج و معالجہ، کھانے پینے، رہائش، ثقافتی اور تعلیم و تربیت کے ابتدائی ضروریات سے بہرہ مند ہونا چاہئے۔

مختصر یہ کہ ہمیں اپنے گنی ہوں کو خلقت کے نظام کی گردان پر نہیں ڈالنا چاہئے۔

خداؤند متعال نے ہم پر کب ایسی زندگی مسلط کی ہے؟ اور کہاں پر اس قسم کے نظام کی تعریف کی ہے؟

اس نے ہمیں آزاد خلق کیا ہے، کیونکہ آزادی ہمارے تکمال اور ارتقا اور ترقی کا راز ہے۔

لیکن ہم اپنی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسروں پر ظلم و ستم کرتے ہیں اور یہی ظلم و ستم معاشرہ کی بدحالی کی صورت میں رو نما ہوتا ہے۔

افسوس کہ بہت سے لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں، یہاں تک کہ معروف و مشہور شعرا کے اشعار میں بھی اس کے نمونے متھے ہیں۔

قرآن مجید ایک مختصر اور با معنی جملہ میں فرماتا ہے:

(إِنَّ الْمُسْلِمَ لِيُظْلَمَ إِنَّ النَّاسَ شَيْءًا لَا يُؤْتُهُ لَكُنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يُظْلَمُونَ) (سورہ یونس، ۳۳)

”اللہ انسانوں پر ذہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے بلکہ انسان خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا کرتے ہیں۔“  
اب ہم آفات و بلیات کے فلسفہ کی بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک طولانی موضوع ہے لیکن ہم اسی مختصر بحث پر اکتفا کرتے ہیں۔

#### غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ آفات و بلیات کے فلسفہ کی بحث کو ہم نے کیوں تین اسماق میں بیان کیا؟
- ۲۔ زندگی کے یکساں ہونے میں کون سے بڑے اثرات ہیں؟ کیا آپ نے کسی کو دیکھا ہے جو اپنی عیش و عشرت کی زندگی سے بیزار ہو؟
- ۳۔ کائنات میں نور و ظلمت کے نظام کے فلسفہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
- ۴۔ کیا معاشرے میں موجود تمام مصیبتوں خلافت کے نظام سے مر بوط ہیں یا ان کے ہم بھی ذمہ دار ہیں؟
- ۵۔ کیا معاشرے کی مصیبتوں کو ختم کرنے کے لئے کوئی صحیح طریقہ موجود ہے؟ مستضعفین کے بارے میں ہماری کیا ذمہ داری ہے؟

## چھٹا سبق

جبر و اختیار کا مسئلہ

پروردگار عالم کی عدالت سے مربوط مسائل میں سے ایک مسئلہ ”جبر و اختیار“ کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ عقیدہ جبر کے قائل لوگوں کے نزدیک انسان کو اپنے اعمال، رفتار اور گفتار پر کسی قسم کا اختیار نہیں ہے اور اس کے اعضا کی حرکات ایک مشین کے پرزوں کے مانند ہیں۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ عدال اللہی سے کیا مناسبت رکھتا ہے؟ شاید اسی وجہ سے اشاعرہ نے، جن کے بارے میں ہم نے گزشتہ سبق میں ذکر کیا اور وہ حسن و فتح عقلی کے منکر ہیں، جبر کو قبول کر کے عدل اللہی سے انکار کیا ہے۔ کیونکہ جبر کو قبول کرنے کی صورت میں ”عدالت“ کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہ جاتا ہے۔

اس بحث کو واضح کرنے کے لئے چند موضوعات کی دقیق وضاحت کرنا ضروری ہے:

### ۱- جبر کے عقیدہ کا سرچشمہ

ہر شخص اپنے وجود کی گہرائیوں میں احساس کرتا ہے کہ وہ اپنے ارادہ میں آزاد ہے، مثال کے طور پر فلاں دوست کی وہ مالی مدد کرے یا یہ کپیاں کی حالت میں اگر اس کے سامنے پانی رکھا جائے تو وہ اسے پئے یانہ پئے۔ اگر کسی نے اس کے خلاف کوئی ظلم کیا ہو تو وہ اسے بخش دے یانہ بخشدے۔ یا یہ کہ ہر شخص بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے کانپنے والے ہاتھ اور اپنے ارادہ سے حرکت کرنے والے ہاتھ کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔

آزادی ارادہ کا مسئلہ انسان کا ایک عام احساس ہونے کے باوجود کیوں انسانوں کا ایک گروہ جبر کا عقیدہ رکھتا ہے؟!

اس کے مختلف اسباب ہیں کہ ہم ان میں سے ایک اہم سبب کو یہاں پر بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان مشاہدہ کرتا ہے کہ ماحول افراد پر اثر دالتا ہے، تربیت بھی ایک دوسری علت ہے اسی طرح پر و پیغامبَر نبی ﷺ اور سماجی ماحول بھی بلاشبہ انسان کی فکر و روح پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کبھی اقتصادی حالات بھی انسان میں تبدیلیاں ایجاد کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ وراشت کے سبب ہونے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

یہ تمام عوامل اس کا سبب بنتے ہیں کہ انسان یہ خیال کرے کہ ہم با اختیار نہیں ہیں بلکہ ہمیں داخلی اور خارجی ذاتی عوامل اکھٹے ہو کر مجبور کرتے ہیں کہ ہم کچھ ارادے اور فیصلے کریں، اگر یہ عوامل نہ ہوتے تو ہم سے بہت سے کام سرزد نہیں ہوتے۔ یہ ایسے امور ہیں، جنہیں ماحول کے جبر، اقتصادی حالات کے جبر، تعلیم و تربیت کے جبر اور وراشت کے جبر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان عوامل میں سے ”مکتب جبر“، فلاسفہ کی زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہے۔

### ۲- جبر یوں کی غلط فہمی کی اصل وجہ

لیکن جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں وہ ایک بنیادی بات سے غافل ہیں اور وہ یہ ہے کہ بحث ”محركات و عوامل“ اور ”عملت ناقصہ“ کے بارے میں نہیں ہے

بلکہ بحث ”علت تامہ“ میں ہے۔ دوسرے الفاظ میں: کوئی شخص انسان کی فکر اور اس کے عمل میں ماحول، تہذیب و تمدن اور اقتصادی اسباب کے اثر انداز ہونے سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔ اصل بحث اس میں ہے کہ ان تمام اسباب کے باوجود فیصلہ کا اختیار ہم ہی کو ہے۔

کیونکہ ہم واضح طور پر محسوس کرتے ہیں کہ سابقہ شہنشاہی نظام جیسے ایک غلط اور طاغوتی نظام میں بھی گمراہ ہونے کے موقع فراہم تھے، لیکن ہم اس کے لئے مجبور نہیں تھے۔ ہمارے لئے اسی نظام اور ماحول میں بھی ممکن تھا کہ ہم رشوت لینے سے پر ہیز کریں، خاشی کے مرکز کی طرف رخ نہ کریں اور آزاد روی سے پر ہیز کریں۔

لہذا ان موقع کو ”علت تامہ“ سے جدا کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے افراد غیر مہذب گھر انوں اور برے ماحول میں پرورش پانے یا نامناسب و رشت کے مالک ہونے کے باوجود اپنے لئے صحیح راہ کا انتخاب کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات یہی افراد اس قسم کے ماحول اور نظام کے خلاف انقلاب برپا کر کے اسے بدل دیتے ہیں، ورنہ اگر یہ ضروری ہوتا کہ تمام انسان ماحول، تہذیب و تمدن اور پروپیگنڈے کے تابع ہوں تو دنیا میں کبھی کوئی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا اور تمام افراد ماحول کے سامنے ہتھیار ڈال کر جدید ماحول پیدا کرنے سے قادر ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مذکورہ عوامل میں سے کوئی ایک بھی ”تقدير ساز“ نہیں ہے بلکہ یہ اسباب صرف موقع فراہم کرتے ہیں اور انسان کی تقدیر کو صرف اس کا ارادہ اور عزم بناتا ہے۔

یہ ایسا ہی ہے کہ ہم ایک انتہائی گرم موسم میں خدا کی اطاعت کرتے ہوئے رکھنے کا عزم کریں جبکہ ہمارے وجود کے تمام ذرات پانی کی خواہش کرتے ہیں لیکن ہم خدا کی اطاعت میں ان کی پرواہ نہیں کرتے جبکہ ممکن ہے کوئی دوسرا شخص حکم خدا کے باوجود اس خواہش کو قبول کر کے روزہ نہ رکھ۔ نتیجہ کے طور پر ان تمام ”اسباب و عوامل“ کے باوجود انسان کے پاس عزم و ارادہ جیسی ایک چیز ہے جس سے وہ اپنا مقدر بناسکتا ہے۔

### ۳۔ مكتب جبر کے سماجی اور سیاسی اسباب

حقیقت یہ ہے کہ ابتداء سے ہی ”جبر و اختیار“ کے مسئلہ کے بارے میں کثرت سے غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ انسان کے ارادہ کی آزادی کی ”نفی“ اور جبر کے عقید کی تقویت کے لئے کچھ خاص عوامل کا ایک سلسلہ بھی موثر کردار ادا کرتا رہا ہے۔ ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

#### الف: سیاسی عوامل

بہت سے جابر و ستمگر حکام محروم اور مستضعف لوگوں کے انقلابی جذبہ کو خاموش کرنے اور اپنی غیر قانونی اور مطلق العنوان حکومت کو باقی رکھنے کے لئے ہمیشہ اس فکر کا سہارا لیتے رہے ہیں کہ ہم خود کوئی اختیار نہیں رکھتے، تقدیر کا ہاتھ اور تاریخ کا جبر ہماری قسمت کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اگر کوئی امیر ہے اور کوئی غریب تو یہ قضاو قدر کے حکم یا ہاتھ کے جبر کے سبب سے ہے!

واضح ہے کہ اس قسم کا طرز فکر کس حد تک لوگوں کے افکار کو بے حس کر سکتا ہے اور جابر حکام کی استعماری اور آمرانہ سیاست کی مدد کر سکتا ہے؟ حالانکہ عقلی اور شرعی طور پر ہماری ”تقدير“ خود ہمارے ہاتھوں میں ہے اور ”جبر“ کے معنی میں قضاو قدر کا بالکل وجود نہیں ہے۔ الی قضاو قدر کی تعین ہماری حرکات، خواہشات، ارادہ، ایمان، جتنی اور کوشاں کے مطابق ہوتی ہے۔

#### ب۔ نفیاتی عوامل

جو کاہل اور سست افراد اپنی زندگی میں اکثر ناکام رہتے ہیں وہ ہر گز اس بات کو قبول نہیں کرتے ہیں کہ ان کی سستی اور خطائیں ان کی شکست کا سبب بنیں۔

ہیں۔ لہذا اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کے لئے ”مکتب جبر“ کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی ناکامی کو اپنی اجباری قسمت کے سر پر ڈالتے ہیں تاکہ اس طرح جھوٹا اور ظاہری سکون پیدا کر سکیں۔ وہ کہتے ہیں: کیا کریں ہماری قسمت کی چادر تو روزاول سے ہی ایسی سیاہ نینگی ہے جسے زمزما حوض کوثر کا پانی بھی سفید نہیں کر سکتا۔ ہم باستعداد بھی ہیں اور ہم نے کوشش بھی کی ہے لیکن افسوس ہماری قسمت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا!

ج۔ سماجی عوامل :

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ وہ آزادی کے ساتھ ہوا وہوس کی راہوں پر چلتے رہیں اور اپنی حیوانی خواہشات کے مطابق ہر گناہ کے مر ٹکب ہوتے رہیں اس کے باوجود خیال کرتے ہیں کہ وہ گناہ کار نہیں ہیں اور سماج میں بھی اس قسم کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہیں۔

اس لئے وہ ”عقیدہ جبر“ کا سہارا لے کر اپنی ہوس رانی کی جھوٹی توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہمیں اپنے کاموں میں کسی قسم کا اختیار نہیں ہے! لیکن بخوبی جانتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے، حتیٰ اس قسم کی باتیں کرنے والے بھی جانتے ہیں کہ ان کے یہ عذر بے نیاد ہیں۔ لیکن عارضی لذتیں اور ناپائیدار منافع انھیں حقیقت کا کھلکھلا بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

لہذا ضروری ہے کہ سماج کو اس جبری طرز فکر سے اور قسمت و تقدیر کو جبرا نتیجہ قرار دینے کے عقیدہ سے بچانے کے لئے کوشش کی جائے۔ کیونکہ اس قسم کا عقیدہ

سامراج طاقتوں کا آرکار اور جھوٹی ناکامیوں کے لئے مختلف بہانوں کا وسیلہ اور سماج میں آسودگی برداشت کا بہت بڑا سبب بنتا ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

ا۔ ”جبر“ اور ”اختیار“ کے نظریہ میں کیا فرق ہے؟

- ۲۔ جبر کا عقیدہ رکھنے والے افراد کس دلیل پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں؟
- ۳۔ ماحول، تہذیب و تمدن اور راثت کے اثرات کا جواب کیا ہے؟
- ۴۔ ان سیاسی، نفسیاتی اور سماجی عوامل کی وضاحت کیجئے جن کی جموٹی توجیہ کے لئے عقیدہ جبر کا سہارا لیا جاتا ہے۔
- ۵۔ ان عوامل کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

## ساتواں سبق

ارادہ و اختیار کی آزادی پر واضح ترین دلیل

ا۔ انسان کا ضمیر جبر کی نفی کرتا ہے  
 اگرچہ الی فلاسفہ اور علماء نے انسان کے ارادہ میں آزاد ہونے کے سلسلہ میں گناہوں دلائل پیش کئے ہیں، مگر ہم اختصار کے پیش نظر ان دلائل میں سے ایک واضح ترین دلیل کو پیش کرتے ہیں اور یہ دلیل ”انسان کا ضمیر“ ہے۔  
 ہم ہر چیز کا انکار کر سکتے ہیں، لیکن اس بات کا انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ ہر معاشرے میں۔ چاہے وہ خدا پرستوں کا معاشرہ ہو یا مادہ پرستوں کا، مشرقی ہو یا مغربی، قدیم ہو یا جدید، امیر ہو یا غریب، ترقی یافتہ ہو یا پسماندہ، معاشرے میں موجود ہر قسم کے افراد اس بات پر متفق ہیں کہ۔ ایک ایسے ”قانون“ کا ہونا ضروری ہے کہ جو معاشرے پر حاکم ہو اور لوگ اس قانون کی پیروی میں اپنی ”ذمہ داری“ پوری کریں اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو ”سزا“ دی جائے۔  
 مختصر یہ کہ ”قانون“ کی حاکیت، عوام کی طرف سے قانون کا احترام اور اس کی ”ذمہ داری“ اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس

کی ”مزرا“ جیسے مسائل پر دنیا کے تمام عقولاء کا اتفاق ہے، البتہ صرف وحشی اور غیر مہذب اقوام ان تینوں بالتوں کو قبول نہیں کرتے۔  
 یہ مسئلہ، جسے ہم ”تمام دنیا کے افراد کے ضمیر“ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، انسان کے اپنے ارادہ میں آزاد ہونے پر واضح ترین دلیل ہے۔  
 یہ کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ و عمل میں مجبور ہوا اور کسی قسم کا اختیار نہ رکھتا ہو لیکن قوانین کا احترام اور ذمہ داری اس کے لئے ضروری ہو اور قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر اس سے باز پر سبھی ضروری ہو کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور ایسا کیوں نہیں کیا؟  
 اور خلاف ورزی ثابت ہونے پر کبھی اس کو جیل کی سزا اور کبھی سزا موت کا بھی سامنا کرنا پڑے۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ہم پہلوؤں سے چھسل کر سڑک پر گرنے والے پتھروں، جو مسافروں کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں، کو عدالت میں لا کر ان کے خلاف مقدمہ چلاکیں۔

یہ صحیح ہے کہ بظاہر ایک انسان اور پتھر کے ٹکڑے کے درمیان بہت فرق ہے۔ لیکن اگر ہم انسان کو اپنے ارادہ میں آزاد نہ جانیں تو یہ فرق بالکل ختم ہو جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں انسان اور پتھر دونوں جبری عوامل کے تالیع ہو جائیں گے۔ پتھر قانون جاذبہ کے تحت سڑک کے پیچے میں آگ رکھتا ہے اور انسان جبری عوامل کی وجہ سے مجرم، قاتل اور سرکش بن جاتا ہے۔ عقیدہ جبر کے قائل افراد کے مطابق ان دونوں کے درمیان کسی بھی قسم کا فرق نہیں ہے اور چونکہ کسی نے اپنے ارادہ سے کام انجام نہیں دیا ہے، لہذا ایک کو عدالت کی کچھری میں کھڑا کرنا اور دوسرا کے کو چھوڑ دینا کیسے صحیح ہو گا؟!  
 ہم ایک دورا ہے پر کھڑے ہیں: یا تمام افراد کے عمومی ضمیر کو غلط اور خطأ قرار دیں اور تمام قوانین، عدالتوں، مجرمین کو دی جانے والی سزاوں کو بہبودہ، بلکہ ظالمانہ کام قرار دیں یا پتھر ”عقیدہ جبر“ کا انکار کریں۔

بیشک دوسری ہی بات قابل ترجیح ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ فلسفی عقیدہ و تفکر کے لحاظ سے عقیدہ جبر کا دم بھرنے والے افراد بھی جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو وہ عملی طور پر ”آزادی ارادہ“ کے عقیدہ پر عمل کرتے ہیں!

کیونکہ اگر کوئی شخص ان کے حقوق کو پہاڑ کرے یا ان کو تکلیف پہنچائے تو اس کو سزا کا مستحق سمجھتے ہیں اور عدالت میں جا کر اس کے خلاف شکایت کرتے ہیں اور کبھی اتنا چیختے چلاتے ہیں کہ جب تک اس کو سزا نہ مل جائے، جیسے نہیں سمجھتے۔

پس اگر انسان اپنے ارادہ میں آزاد نہیں ہے تو یہ سرزنش، شکایت اور شور و غوغہ اور داد و فریاد کس لئے کرتا ہے؟!  
 بہر حال دنیا کے عقولا کا عمومی ضمیر اس بات پر زندہ دلیل ہے کہ ”ارادہ کی آزادی“ کی حقیقت کا اقرار تمام انسان اپنے دل کی گہرائیوں سے کرتے ہیں اور ہمیشہ اس کے حامی اور طرفدار ہے ہیں اور اپنی زندگی کا ایک دن بھی اس عقیدہ کے بغیر نہیں گزار سکتے ہیں اور اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو اس کے بغیر نہیں چلا سکتے ہیں۔

عظمیم اسلامی فلاسفہ، ”خواجہ نصیر الدین طوسی“، جبرا و اختیار کی بحث کے دوران ایک محضرا اور جامع عبارت میں فرماتے ہیں:

”والضرورة فاضمیہ باستناد افعالنا الینا“، (تحریر العقادہ، بحث جبرا و اختیار)

”ہمارا ضمیر اس بات کا متفاوضی ہے کہ ہمارے تمام اعمال خود ہم سے مربوط ہیں۔“

۲۔ ”جبرا“ کی منطق کا مذہب کی منطق سے تضاد

نمذکورہ گفتگو کا تعلق اس بات سے تھا کہ جبر کا عقیدہ دنیا کے عقلاء کے عمومی ضمیر سے تضاد رکھتا ہے خواہ یہ عقلاء کسی مذہب کے ماننے والے ہوں یا لا مذہب۔

لیکن ہم نہ ہی طرز فکر کے لحاظ سے بھی ایسے قطعی اور یقینی دلائل رکھتے ہیں جو عقیدہ جبر کے باطل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ نہ ہی عقائد ہر گز جبر کے عقیدہ کے موافق نہیں ہیں کیونکہ عقیدہ جبر کو قبول کرنے کی صورت میں نہ ہی اصول و قوانین بھی مندوش ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم گز شنة بحث میں واضح طور پر ثابت کئے گئے عدل اللہ کو جبر کے عقیدہ کی روشنی میں ثابت نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند متعال کسی کو بر اکام انعام دینے پر مجبور کر کے اور پھر اس کو ایسا کام انعام دینے کے جرم میں سزادے اور باز پرس کرے کہ کیوں یہ کام انعام دیا؟ یہ کسی بھی منطق و عقل کے مطابق نہیں ہے!

امذا جبر کے عقیدہ کو قبول کرنے کی صورت میں ثواب و عقاب اور جنت و جہنم بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی آیات میں نامہ اعمال، سوال و جواب، اللہ حساب، بدکاروں کی نہمت اور صالحین کی ستائش میں ذکر ہوئے مفہوم ہجی بے معنی ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس عقیدہ کی بنیاد پر نیک اور بدکار افراد کے ارادہ و اختیار میں کچھ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ہم نہ ہب میں سب سے پہلے انسان کی ”تکلیف اور ذمہ داری“ سے مواجه ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انسان مجبور ہو تو کیا پھر اس ”تکلیف اور ذمہ داری“ کا کوئی مطلب اور مفہوم ہے؟!

کیا ہم رعشہ کے مرض میں بتا کسی مرض کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے ہاتھ کی تھر تھراہٹ کو روک لے یا کسی ترائی میں پھسلنے والے شخص کو کہہ سکتے ہیں کہ رک جائے؟

بھی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام ایک مشہور روایت میں مکتب جبر کو بت پرستوں اور شیطان کی جماعت کا مکتب قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”تک مقالہ انخوان عبدۃ الاوثان و حضماء الرحمن و حزب الشیطان“ (اصول کافی ج ۱، ص ۱۱۹ باب جبر والقدر)

”یہ بت پرستوں کے بھائیوں، خدا کے دشمنوں اور شیطان کے گروہ کی باتیں ہیں۔“

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ جبر کے بطلان کی واضح ترین دلیل کیا ہے؟

۲۔ ارادہ کی آزادی کے سلسلے میں دنیا کے لوگوں کے ضمیر کی وضاحت کیجئے۔

۳۔ کیا "جبر کا عقیدہ رکھنے والے عملی طور پر بھی "جبر" کے مطابق عمل کرتے ہیں؟

۴۔ کیا "جبر کا عقیدہ" "عدل الٰہی" کے موافق ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟

۵۔ ارادہ کی آزادی ہر قسم کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی بنیاد کس طرح ہے؟

## آٹھواں سبق

"امر میں الامرین" (یا سلطی مکتب) کیا ہے؟

۱۔ "جبر" کے مقابلہ میں "عقیدہ تقویض" "افراط پر مبنی"

"عقیدہ جبر" کے مقابلہ میں "تقویض" کے نام سے ایک دوسرا مکتب موجود ہے۔ یہ مکتب "تفریط" پر مبنی ہے۔

عقیدہ تقویض کے معتقد افراد کا کہنا ہے: خداوند متعال نے ہمیں پیدا کرنے کے بعد تمام کام ہمارے سپرد کر دیئے ہیں اور اب خدا کا ہمارے اعمال و افعال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا ہم اپنے اعمال کے قلمرو میں مکمل اور مستقل طور پر آزاد اور حاکم ہیں!

بیشک، یہ عقیدہ بھی "عقیدہ توحید" کے بالکل موافق نہیں ہے، کیونکہ "توحید" نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ تمام کائنات خدا کی ملکیت ہے اور کوئی چیز اس کی دسترس سے خارج نہیں ہے، حتیٰ کہ ہمارے اعمال ہمارے ارادہ کی آزادی کے باوجود اس کی دسترس اور قدرت سے ہر گز باہر نہیں ہو سکتے ورنہ شرک لازم آئے گا۔

واضح تر عبارت میں: ہم دو خداوں کے قائل نہیں ہو سکتے ہیں کہ ان میں سے ایک بڑا خدا ہو جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے اور دوسرا چھوٹا خدا یعنی "انسان" جو اپنے تمام اعمال و افعال میں اس قدر آزاد اور با اختیار ہے کہ خداوند متعال بھی اس کے اعمال و افعال پر اثر انداز نہیں ہو سکتا!

یہ واضح شرک ہے اور دو یا چند خداوں کی پرستش ہے۔ حق بات یہ ہے کہ ہم انسان کو آزاد اور با اختیار بھی تسلیم کریں اور خداوند متعال کو اس پر اور اس کے اعمال پر حاکم بھی نہیں۔

## ۲۔ در میانی مکتب

بادیک ساختہ یہی ہے کہ ہم یہ خیال نہ کریں کہ ان مذکورہ دو باتوں کے درمیان تفہاد موجود ہے۔ اس امر میں گہری فکر کی ضرورت ہے کہ ہمیں خداوند متعال کی ”عدالت“ کو بھی مکمل طور پر قبول کرنا چاہئے، اس کے بندوں کے لئے ”آزادی“ اور ”ذمہ داری“ کا بھی قائل ہونا چاہئے، اس کے علاوہ پوری کائنات پر اس کی حاکمیت اور توحید کا بھی قائل ہونا چاہئے اور یہ وہی چیز ہے جسے ”امر میں الامرین“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (یعنی وہ عقیدہ جو افراد و تفریط کے درمیان واقع ہوا ہے)

چونکہ یہ بحث ذرا بیچیدہ اور دقيق ہے، لہذا ہم اس کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

فرض کیجئے آپ بھلی سے چلنے والی ایک ریل گاڑی میں سفر کر رہے ہیں اور اس ٹرین کے ڈرائیور بھی آپ ہی ہیں۔ ٹرین کے پورے راستے پر بھلی کا ایک قوی تار کھینچا گیا ہے اور ٹرین کی چھپت پر لگا ہوا ایک مخصوص دائرہ (کرٹ) بھلی کے اس تار سے ملا ہوا ہے اور حرکت کر رہا ہے اور لمحہ بہ لمحہ بھلی کو ایک قوی مرکز سے ٹرین کے انجن میں اس طرح منتقل کر رہا ہے کہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی اس قوی مرکز سے ٹرین تک بھلی نہ پہنچے تو ٹرین فوراً ک جائے گی۔ اس ٹرین کے ڈرائیور کی حیثیت سے بیشک آپ آزاد ہیں کہ راستے میں جہاں پر بھی چاہیں ٹرین کو روک سکتے ہیں، اسے آہستہ یا تیز چلا سکتے ہیں لیکن اس تمام آزادی کے باوجود بھلی کے مرکز یعنی بھلی گھر میں بیٹھا ہوا شخص جب چاہے بھلی کو منقطع کر کے آپ کی ٹرین کو روک سکتا ہے۔ کیونکہ آپ کی ٹرین کی حرکت بھلی کی مرہون منت ہے اور اس کی چابی مرکز برق میں بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ہے۔

اس مثال میں غور کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ ٹرین کا ڈرائیور تمام تر آزادی، اختیار اور ذمہ داری کے باوجود کسی اور کے کنٹرول میں ہے اور یہ دونوں امرا ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

## دوسری مثال :

فرض کیجئے کوئی شخص کسی بیماری یا حادثہ کی وجہ سے اپنے ہاتھوں کے اعصاب سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے پر قادر نہیں ہوتا ہے۔ اگر اس کے اعصاب کو ایک خفیف اور ملایم بر قی رو سے ارتبا طد دیا جائے تو اس کے اعصاب گرم ہو کر دوبارہ حرکت میں آسکتے ہیں۔ اب یہ شخص اسی ہاتھ سے کوئی بھی کام انجام دے سکتا ہے۔ مثلاً اگر یہ شخص اسی ہاتھ سے کہ جس سے بر قی رو کا اتصال ہے کسی پر ظلم کرے، کسی کے چہرے پر طما نچہ مارے یا کسی بے گناہ کے سینے میں چھرا گھونپ دے تو وہ اپنی اس حرکت پر نیقیناً جواب دہ ہو گا۔ کیونکہ اس نے اپنی قدرت اور اختیار سے اس کام کو انجام دیا ہے۔ اور قادر و مختار شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس انسان کے ہاتھ میں بر قی رو داخل کرنے والا شخص بھی اس پر حاکمیت رکھتا ہے اور یہ انسان اپنی تمام آزادی و اختیار کے باوجود اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔

اب ہم اصلی مطلب کی طرف پلتتے ہیں:

خداوند متعال نے ہمیں ہمت اور طاقت عطا کی ہے، ہمیں عقل و ہوش اور جسمانی طاقت سے نوازا ہے۔ یہ تمام وسائل ہمیں لمحہ بہ لمحہ خداوند متعال کی

طرف سے عطا ہو رہے ہیں اگر ایک لمحہ کے لئے بھی خداوند متعال کا لطف و کرم ہم پر کر جائے اور اس سے ہمارا باطلہ مقطوع ہو جائے تو ہم نا یود ہو کر رہ جائیں گے۔

اگر ہم کوئی کام انجام دیتے ہیں تو یہ اسی کی طرف سے عطا کردہ قوت کے نتیجہ میں ہے جو لمحہ بہ لمحہ جاری ہے حتیٰ کہ ہماری آزادی اور اختیار بھی اسی کی طرف سے عطا کی ہوئی نعمت ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم آزاد ہوں اور اس کی عظیم نعمتوں کے سایہ میں کمال کی منزل تک پہنچنے کا راستہ طے کریں۔

پس ہم اختیار اور ارادہ کی آزادی کے باوجود اس کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اس کی بارگاہ میں سر جھکائے ہوئے ہیں اور اس کی حاکمیت کے قلمرو سے باہر نہیں ہو سکتے۔ ہم تمام تر قدرت اور توانائی کے باوجود اسی کے مر ہون منت ہیں اور اس کے بغیر کچھ بھی نہیں ہیں۔ ”الامر بین الامرین“ کا یہی معنی و مفہوم ہے، کیونکہ ہم نے کسی بھی موجود کو اس کے مثل قرار نہیں دیا ہے کہ شرک لازم آئے اور نہ ہی خدا کے بندوں کو ان کے اعمال میں مجبور جانتے ہیں کہ ظلم لازم آئے۔ (غور فرمائیے!)۔

ہم نے یہ درس مکتب اہل بیت علیہم السلام سے حاصل کیا ہے، کیونکہ ان حضرات سے سوال کیا جاتا تھا کہ کیا جبر و تفویض کے درمیان کوئی تیراستہ بھی ہے؟ تو وہ فرماتے تھے:

(”ہاں، تیراستہ بھی موجود ہے جو زمین و آسمان کے درمیان فاصلہ سے وسیع تر ہے۔“) (اصول کافی: ج ۱، ص ۱۲۱ باب الجبر والقدر والا مر بین الامرین)

۳۔ قرآن مجید اور جبر و اختیار کا مسئلہ

قرآن مجید انسان کے ارادہ میں آزادی کے مسئلہ کو واضح طور پر ثابت کرتا ہے اور اس سلسلہ میں قرآن مجید میں سینکڑوں آیات ذکر ہوئی ہیں۔

الف۔ وہ تمام آیات جن میں امر و نہیں، ذمہ دار یوں اور اصول و قوانین کا ذکر کیا گیا ہے، اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار میں آزاد ہے، کیونکہ اگر انسان آزاد نہ ہو تو اس کو بعض کاموں کا حکم دینا اور بعض کاموں سے روکنا غوہ بیہودہ شمار ہو گا۔

ب۔ بدکاروں کی نہ مت اور نیک لوگوں کی ستائش میں بیان شدہ آیات انسان کے خود مختار ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ ”جبر“ کی صورت میں نہ مت اور مدرج و ستائش بے معنی ہو گی۔

ج۔ جن تمام آیات میں قیامت سے متعلق سوال، اور اس دن کے فیصلے کا دن ہونے اور پھر اس کے نتیجہ میں جزا و سزا اور جنت و جہنم کا ذکر ہوا ہے، وہ انسان کے باختیار ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ جبر کی صورت میں ان آیات کا کوئی مفہوم نہیں ہو گا اور سوال و جواب، روز قیامت کی عدالت میں پیشی اور بدکاروں کو سزا ملنا ”ظلم محض“ شمار ہو گا۔

د۔ انسان کو اس کے اعمال کا مر ہوں منت قرار دینے والی آیات، جیسے:

”کل نفس بہما کسبت رہیتی“ (سورہ مدثہ ۳۸)

”ہر نفس اپنے اعمال میں گرفتار ہے“

”کل امری عہما کسبت رہیں“ (سورہ طورہ ۲۱)

”ہر شخص اپنے اعمال کا گردی ہے۔“

یہ آیات واضح طور پر انسان کے صاحب اختیار ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

ھ۔ (إِنَّا هُدَىٰ لِلشَّيْءِ رَبِّا شَاكِرًا وَأَوْمًا كَفُورًا)

(سورہ دہر، ۳)

”یقیناًہم نے اسے راستہ کی ہدایت دیدی ہے چاہے وہ شکر گزار ہو جائے یا کفران نعمت کرنے والا ہو جائے“  
”ذکورہ آیت بھی ہمارے اس مدعاعو ثابت کرتی ہے

قرآن مجید میں بعض ایسی تعبیرات وارد ہوئی ہیں جو ”امرین الامرین“ کے عقیدہ پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن بعض ناؤگاہ لوگوں نے غلط فہمی سے ان آیات کو عقیدہ جبر کے حق میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً:

(وَمَا تَنْهَىٰ عَنِ الْأَنْ يَشَاءُ اللَّهُ) (سورہ دہر، ۳۰)

”اور تم لوگ تو صرف وہی چاہتے ہو جو پروردگار چاہتا ہے۔“

واضح ہے کہ ذکورہ آیت اور اس جیسی دوسری آیات انسان سے اختیار کو سلب کرنا نہیں چاہتی ہیں بلکہ اس حقیقت کو ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ تم تمام اختیارات اور آزادی کے باوجود خداوند متعال کے قبضہ قدرت میں ہو۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ ”تفویض“ سے کیا مراد ہے؟ اور اس عقیدہ میں کوئی ناسعیب ہے؟
- ۲۔ ”امرین الامرین“ کے عقیدہ کی تعلیم ہم نے ائمہ اہل بیت (ع) سے حاصل کی ہے، اس مطلب کی مثال کے ساتھ وضاحت کیجئے۔
- ۳۔ ”جر“ و ”اختیار“ کے مسئلہ کے بارے میں قرآن مجید کی آیات کیا کہتی ہیں؟
- ۴۔ اگر ہم جبر کے عقیدہ کو صحیح جان لیں تو پھر قیامت کے دن، جنت و جہنم اور سوال و جواب کے عقیدہ پر کیا اثر پڑے گا؟
- ۵۔ کیا ”وَمَا تَنْهَىٰ عَنِ الْأَنْ يَشَاءُ اللَّهُ“ اور اس جیسی دوسری آیات ”جر“ پر دلالت کرتی ہیں؟

## نوال سبق

ہدایت و گمراہی خدا کے ہاتھ میں ہے

۱۔ ہدایت و گمراہی کی اقسام :

ایک مسافر اپر س ہاتھ میں لئے ہوئے آپ کے پاس آتا ہے اور آپ سے راہنمائی کا تقاضا کرتا ہے۔ آپ کے پاس اسے مقصد تک پہنچانے کے لئے دو راستے ہیں:

ایک یہ کہ اس کے ساتھ جا کر کمال بنیکی اور حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے منزل مقصود تک پہنچادیں اور خدا حافظ کہہ کرو اپس آ جائیں۔ دوسرا یہ کہ ہاتھ کے اشارہ اور مختلف نشانیوں کے ذریعہ اسے مطلوبہ جگہ کی طرف راہنمائی کریں۔

بیشک آپ نے دونوں صورتوں میں منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے اس کی راہنمائی کی ہے۔ لیکن ان دونوں طریقوں میں ایک واضح فرق ہے۔ دوسرा طریقہ صرف راستہ دکھانا ہے جبکہ پہلا طریقہ ”مطلوبہ مقصد تک پہنچانا“ ہے۔ قرآن مجید اور اسلامی روایات میں ”ہدایت“ مذکورہ دونوں معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔

ایک اور اعتبار سے کبھی ہدایت صرف ”ترشیح“ صورت کی حامل ہوتی ہے یعنی قوانین اور دستور ارکے طریقہ سے واقع ہوتی ہے اور کبھی ”تکونی“ صورت کی حامل ہوتی ہے، یعنی خلقت کے نظام کی راہوں سے ہدایت کی جاتی ہے، جیسے ایک کمکمل انسان بننے کے لئے نطفہ کی مختلف مراحل میں ہدایت۔ یہ دونوں معانی بھی قرآن مجید اور روایات میں ذکر ہوئے ہیں۔ ہدایت کی اقسام واضح ہونے کے بعد ہم اصل مطلب کی طرف پلٹتے ہیں۔ (ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی بھی اسی طرح ہے)۔

ہم بہت سی آیات میں پڑھتے ہیں کہ ہدایت اور گمراہی خدا کام ہے۔ بیشک ”راستہ دکھانے“ کا تعلق خدا سے ہے، کیونکہ اس نے انبیاء کو بھیجا ہے اور آسمانی کتابیں نازل کی ہیں تاکہ انسان کی راہنمائی کریں۔

لیکن جبکہ طور پر ”مقصد تک پہنچانا“ یقیناً ارادہ اختیار کی آزادی کے خلاف ہے۔ چونکہ خداوند متعال نے منزل مقصود تک پہنچانے کی تمام قوتوں ہمارے اختیار میں دے رکھی ہیں اور ہمیں تو فیض بخشنے والوں ہی ہے، لہذا ہدایت کے یہ معنی بھی خداوند متعال کی طرف سے ہیں، یعنی خداوند متعال نے تمام عوامل اور مقدمات کو انسان کے اختیار میں قرار دیا ہے تاکہ وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے۔

۲۔ ایک اہم سوال

یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کی بہت سی آیات میں پڑھتے ہیں: ”خداوند متعال جسے چاہے ہدایت کرتا ہے اور جسے چاہے گراہ کرتا

ہے: جیسے یہ آیت:

(فَيُضْلِلُ اللَّهُمَّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ) (سورہ ابراھیم، ۲)

”خدا جس کو چاہتا ہے گر اہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ صاحب عزت بھی ہے اور صاحب حکمت بھی۔“<sup>۱</sup> بعض افراد قرآن مجید کی دیگر آیات اور خود آیتوں کی ایک دوسرے کی تفسیر کو مد نظر رکھے بغیر، اس قسم کی آیات کامشاہدہ کر کے اعتراض کی زبان کھولتے ہیں اور سوال کرتے ہیں: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا جسے چاہے ہدایت کرے اور جسے چاہے گراہ کرے؟ پس ہمارا کیا قصور ہے؟! اہم بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کے وقت ہمیشہ دوسری آیات کے ساتھ ان کے رابطہ کو مد نظر رکھنا چاہئے تاکہ ہم ان کے اصلی اور حقیقی مفہوم سے آشنا ہو جائیں۔ ہم یہاں پر ہدایت و گمراہی سے مر بوظ چند دوسری آیات کی نمونہ کے طور پر وضاحت کرتے ہیں تاکہ انھیں مذکورہ آیات کے ساتھ ملا کر آپ خود ضروری اور اصلی مطلب کو حاصل کر سکیں:

سورہ ابراھیم کی آیت نمبر ۷ میں آیا ہے:

(وَيُضْلِلُ اللَّهُمَّ الظَّالِمِينَ)

”خداوند متعال ظالمین کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔“

اسی آیہ شریفہ کا ترجمہ اگر یوں کیا جائے تو مذکورہ اشکال دور ہو جائے گا: ”خدا سے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے جو (گمراہی) چاہتا ہے اور اسے ہدایت دیتا ہے جو ”ہدایت“ چاہتا ہے۔ توجہ فرمائیے۔

ہم سورہ غافر کی آیت نمبر ۳۷ میں پڑھتے ہیں:

(كَذَلِكَ يُضْلِلُ اللَّهُمَّ هُوَ مُسْرِفٌ مُرْتَابٌ)

”خدا زیادتی کرنے والے اور شکلی مزان انسانوں کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔“

سورہ عنكبوت کی آیت نمبر ۲۹ میں ہے:

(وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لِنَهْدِيَنَّا هُمْ سَبَلُنَا )

”اور جن لوگوں نے ہمارے حق میں جہاد کیا ہے ہم انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے۔“

جیسا کہ ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ خداوند متعال کی مشیت اور اس کا ارادہ بلا وجہ نہیں ہے، نہ وہ کسی کو بلا وجہ ہدایت کی توفیق عطا کرتا ہے اور نہ کسی سے بلا وجہ سلب توفیق کرتا ہے۔

جو لوگ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، جنگ کی مشکلات کو برداشت کرتے ہیں، اپنی نفسانی خواہشات کا مقابلہ کرتے ہیں، خدا کے دشمنوں کے خلاف ثابت قدمی کا ثبوت دیتے ہیں، خداوند متعال نے انھیں ہدایت کرنے کا وعدہ دیا ہے اور یہ وعدہ عین عدالت ہے۔

لیکن جو لوگ ظلم و ستم کی بنیاد ڈالتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں زیادتی، شک و شبہ اور دسواس ایجاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خدا نے متعال ان سے ہدایت کی توفیق کو چھین لیتا ہے اور ان اعمال کے نتیجہ میں ان کا دل تاریک اور سیاہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ سعادت کی منزل تک پہنچنے سے محروم

ہو جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے گراہ کر دینے کے معنی بھی ہیں کہ خداوند متعال ہمارے اعمال کے نتیجہ کو ہمارے اختیار میں دے دیتا ہے اور یہ بھی یعنی عدالت ہے (توجہ فرمائیں)!

۳۔ کیا خدا اکاذی علم گناہ کی علت ہے؟

آخری مطلب جو جبر و اختیار کی بحث میں بیان کرنا ضروری ہے، وہ جبری عقیدہ کے قائل بعض لوگوں کا ”خدا کے اذی علم“ کے عنوان سے پیش کیا جانے والا بہانہ ہے۔

وہ کہتے ہیں: کیا خداوند متعال جانتا تھا کہ فلاں شخص فلاں وقت کسی کو قتل کرنے یا شراب پینے کے جرم کا مرتكب ہو گا؟ اگر آپ کہیں خدا نہیں جانتا تھا، تو آپ خدا کے علم کا انکار کرتے ہیں، اور اگر کہیں کہ وہ جانتا تھا تو اس شخص کو وہ کام ضرور انجام دینا چاہئے ورنہ خدا کا علم واقع کے خلاف ہو گا۔ لہذا خداوند متعال کے علم کو صحیح ثابت کرنے کے لئے گناہ گاروں کو مجبوراً مرتكب گناہ ہونا چاہئے اور اطاعت کرنے والوں کو مجبور آس کی اطاعت کرنی چاہئے۔

لیکن ایسے افراد اپنے گناہوں اور خطاوں پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ بہانہ تراشیاں کرتے ہیں۔ حقیقت میں وہ ایک نکتہ سے غافل ہیں کہ ہم کہتے ہیں خداوند متعال ازل سے ہی جانتا تھا کہ ہم اپنے ارادہ و اختیار سے اطاعت یا گناہ انجام دیتے ہیں، یعنی ہمارا اختیار و ارادہ بھی خدا کے علم میں ہے۔ پس اگر مجبور ہو جائیں تو خدا کا علم جہل میں تبدیل ہو جائے گا۔ (توجہ فرمائیں)

اس بات کی مزید وضاحت کے لئے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

فرض کیجئے ایک معلم جانتا ہے کہ فلاں شاگرد اپنی سستی اور کابیلی کی وجہ سے فیل ہو جائے گا۔ اس کا یہ علم سو فیصد صحیح ہے کیونکہ یہ اس کے کئی برسوں کے تجربوں پر مبنی ہے۔

کیا فیل ہونے کی صورت میں وہ شاگرد اپنے معلم کا گریبان پکڑ کر کہہ سکتا ہے کہ آپ کی پیشین گوئی اور علم نے مجھے فیل ہونے پر مجبور کیا؟! اس سے بھی بہتر مثال یہ کہ فرض کریں ایک نیک اور بے خطا انسان ایک برے حادثہ کے وقوع سے پہلے اس کے بارے میں آگاہ ہو جاتا ہے اور کسی مصلحت کی بناء پر اس معاملہ میں مداخلت نہیں کرتا ہے، کیا اس نیک اور بے گناہ انسان کا علم مجرم کی ذمہ داری کو سلب کرے گا اور اسے جرم کا مرتكب ہو نے پر مجبور کرے گا؟! (دققت فرمائیں)

یا فرض کریں کہ ایک ایسی جدید مشین ایجاد ہو جو آئندہ رونما ہونے والے حادثہ کے بارے میں چند لمحے پہلے ہمیں خبر دے۔ ہمیں یہ مشین دینکن اطلاع دیتی ہے کہ فلاں شخص اپنے کمل اختیار و ارادہ سے فلاں وقت فلاں کام انجام دے گا۔ کیا یہ پیشین گوئی کسی کے لئے جزو زبردستی کا سبب بن سکتی ہے؟! مختصر یہ کہ علم خدا ہر گز کسی کو کسی کام پر مجبور نہیں کرتا ہے۔

## غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ ہدایت کی اقسام بیان کر کے ان کی وضاحت کیجئے۔
- ۲۔ قرآن مجید کی آیات سے ایک ایسی آیت بیان کیجئے جس میں ہدایت و گمراہی کو خدا کی طرف نسبت دی گئی ہو۔
- ۳۔ خدا کی ہدایت اور خدا کی گمراہی سے کیا مراد ہے؟
- ۴۔ خداوند متعال کے ”ازلی علم“ سے کیا مراد ہے؟
- ۵۔ کیا خدا کا ازالی علم ہمارے اختیار اور ذمہ دار یوں کو سب کر دیتا ہے؟ اس سلسلہ میں ایک مثال کے ساتھ وضاحت کیجئے۔

## دسوال سبق

عدل الٰی اور مسئلہ ”خلود“

ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید نے کفار اور گناہگاروں کے ایک گروہ کے بارے میں واضح طور پر داعی سزا دینے یعنی دوسرے الفاظ میں ”خلود“ کا ذکر کیا ہے۔

سورہ توبہ کی آیت نمبر ۲۸ میں آیا ہے:

(وَعْدَ اللَّهُ لِلْمُفْقِدِينَ وَالْمُفْقَطِ وَالْكَافِرَنَار جَحَنَّمُ خَلَدِينَ فِيهَا)

”اللہ نے منافق مردوں اور عورتوں سے اور تمام کافروں سے آتش جہنم کا وعدہ کیا ہے جس میں یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔“

اسی طرح اس آیت کے ذیل میں با بیان مردوں اور عورتوں کے لئے بہشت کے باغوں کا ہمیشہ کے لئے وعدہ کیا ہے:

(وَعْدَ اللَّهِ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمَنَاتِ جَنَّةٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَلَدِينَ فِيهَا) (سورہ توبہ ۷۲)

”اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ان باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔“

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کو کیسے قبول کیا جائے کہ ایک انسان جس نے دنیا میں زیادہ سے زیادہ اسی سال یا سو سال زندگی گزاری ہوا اور اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہو، اسے کروڑوں سال بلکہ ہمیشہ سزا دی جائے؟!

البته یہ مطلب نیک اعمال کی جزا کے بارے میں زیادہ ہمیت نہیں رکھتا کیونکہ خدا کی رحمت کا سمندر و سعیج ہے اور جزا حقیقی زیادہ ہو خدا کی بے انہصار حمت اور اس کے فضل و کرم کی علامت ہو گی۔ لیکن برے اعمال اور محدود گناہوں کے متیجہ میں ہمیشہ کے لئے اس کو کیسے عذاب میں مبتلا کھا جا سکتا ہے۔ خداوند متعال کی عدالت کے پیش نظر اس کی کیا وجہ بیان کی جاسکتی ہے؟

کیا گناہ اور اس کی سزا کے درمیان ایک قسم کا تعادل برقرار نہیں ہونا چاہئے؟

جواب :

اس بحث اور سوال کے قطعی حل اور جواب تک پہنچنے کے لئے چند نکات پر دقت کے ساتھ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے:

الف: قیامت کے دن کی سزا میں اس دنیا کی سزاوں سے ہر گز شبات نہیں رکھتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص دنیا میں کسی جرم، جیسے چوری وغیرہ کامر تکب ہو جائے تو اسے ایک خاص مدت تک جیل میں ڈال دیا جاتا ہے، لیکن قیامت کی سزا میں اکثر انسان کے اعمال کے آثار اور اس کے کاموں کی خاصیتوں کے اعتبار سے ہوتی ہیں۔

واضح تر عبارت میں گناہگاروں کی تمام سزاویں، جن کا سامنا نہیں دوسرا دنیا (قیامت) میں کرنا پڑتا ہے در حقیقت ان کے اپنے کئے گئے گناہوں کا نتیجہ ہے جو ان کے دامن گیر ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ایک واضح تعبیر موجود ہے، فرماتا ہے:

(فَالْيَوْمَ لَا تَظْلِمُ نَفْسٌ شَيْئًا لَا تَجْرِونَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ) (سورہ یس ۵۳)

”پھر آج کے دن کسی نفس پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا اور تم کو صرف ویسا ہی بدله دیا جائے گا، جیسے اعمال تم کر رہے تھے۔“

ایک آسان مثال سے ہم اس حقیقت کو واضح کر سکتے ہیں:

ایک شخص منشیات یا شراب پینے کا عادی ہے، جتنا بھی اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ زہر لیلی چیزیں تیرے معدہ کو خراب، تیرے دل کو بیمار اور تیرے اعصاب کو مجرد کر دیں گی، وہ پرانہ نہیں کرتا ہے۔ چند ہفتے یا چند مہینے ان مہلک چیزوں کی خیالی لذت میں غرق رہتا ہے اور اس کے بعد بتدریج ختم معدہ، عارضہ قلب اور اعصاب کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر دس سیوں سال عمر بھر ان بیماریوں میں مبتلا ہو کر شب و روزان کے عذاب میں گزارتا ہے۔ کیا یہاں

پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اس شخص نے تو چند ہفتے یا چند مہینے سے زیادہ عرصہ منتظر یا شراب کا استعمال نہیں کیا تھا، دسیوں سال عمر بھر کیوں امراض میں مبتلا ہو گیا؟

اس کے جواب میں فوراً کہا جائے گا یہ اس کے عمل کا نتیجہ واٹر ہے! حتیٰ اگر وہ حضرت نوحؐ کی عمر سے بھی زیادہ یعنی دسیوں ہزار سال بھی عمر پائے اور مسلسل رنج و عذاب میں رہے تب بھی ہم یہی کہیں گے کہ اس نے جان بوجھ کر اور آگاہانہ طور پر اس چیز کو اپنے لئے خریدا ہے۔

قیامت کے دن کی سزا میں زیادہ تر اسی طرح ہیں، اس نے عدالت الٰہی پر کسی قسم کا اعتراض باقی نہیں رہتا ہے۔

ب: بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سزاوں کی مدت گناہ کی مدت کے برابر ہونی چاہئے، یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے، کیونکہ گناہ اور اس کی سزا کے درمیان زمانہ کے اعتبار سے کوئی ربط نہیں ہے بلکہ سزا کا تعلق اس گناہ کی کیفیت اور نتیجہ سے ہوتا ہے۔

مثلاً ممکن ہے کوئی شخص ایک لمحہ میں ایک بے گناہ انسان کو قتل کر دے اور اس دنیا کے بعض قوانین کے مطابق اسے عمر قید کی سزا دی جائے۔ یہاں پر ہم دیکھتے ہیں کہ گناہ انعام دینے کی مدت صرف ایک لمحہ تھی جبکہ سزا کی مدت دسیوں سال (عمر بھر) ہے، اور کوئی شخص اس سزا کو ظالمانہ شمار نہیں کرتا ہے، کیونکہ یہاں پر مٹ، گھٹئے، مینیے یا سال کی بات نہیں ہے بلکہ گناہ کی کیفیت اور نتیجہ مد نظر رکھا جاتا ہے۔

ج: جہنم میں ”خلود“، ہیئتی، اور دامنی سزا میں ان لوگوں کے لئے ہیں، جنہوں نے نجات کے تمام راستے اپنے اوپر بند کرنے ہوں اور جان بوجھ کر فساد، تباہی اور کفر و نفاق میں غرق ہوئے ہوں اور گناہوں نے ان کے سارے وجود کو اپنے پیٹ میں لے لیا ہو کہ حقیقت میں وہ خود گناہ و کفر کا روپ اختیار کر گئے ہوں۔

قرآن مجید میں یہاں پر ایک خوبصورت تعبیر ہے :

(بِلِّيْ مِنْ كَسْبِ سَيِّءَةٍ وَاحِاطَتْ بِهِ خَطِيئَةٌ فَاوَلَكُمْ أَصْلَحُ النَّارَ حِمْ فِيهَا خَلْدُونَ) (سورہ بقرہ ۸۱)

”یقیناً جس نے کوئی برائی حاصل کی اور اس کے گناہ نے اسے گھیر لیا، وہ لوگ اہل جہنم ہیں اور وہیں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔“

اس قسم کے افراد خداوند متعال کے ساتھ اپنے رابطہ کو مکمل طور پر منقطع کر لیتے ہیں اور نجات کے تمام راستوں کو اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔

ایسے افراد کی مثال اس پر نہ کے مانند ہے جس نے جان بوجھ کر اپنے پروں کو توڑ کر آگ لگادی ہوا اور وہ مجبور ہے ہمیشہ زمین پر رہے اور آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے سے محروم رہے۔

ذکورہ بالا تین نکات اس حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں کہ دامنی عذاب کا مسئلہ جو کہ متفقین اور کفار کے ایک خاص گروہ کے لئے مخصوص ہے ہر گز ”عدل الٰہی“ کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ ان کے برے اعمال کا نتیجہ ہے اور ان کو پہلے ہی اس بات سے انبیاء الٰہی کے ذریعہ آگاہ کیا جا چکا ہے کہ ان کاموں کا نتیجہ اتنا تلخ اور براہے۔

اگر یہ افراد جاہل ہوں اور انبیاء کی دعوت ان تک نہ پہنچی ہو اور جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایسے اعمال کے مرتكب ہوئے ہوں تو وہ یقیناً اس قسم کی سزا کے مستحق نہیں ہوں گے۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کی آیات اور اسلامی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ گناہگاروں کے ایک بڑے گروہ کو بھی بخش دیا جائے گا:

کچھ لوگ شفاعت کے ذریعے

کچھ لوگ معافی کے ذریعے

کچھ لوگ معمولی نیک اعمال کے ذریعہ خدا کے فضل و کرم سے کثیر اجر پا کر بخش دئے جائیں گے۔

اور کچھ لوگ ایک مدت تک جہنم میں اپنے برے اعمال کی سزا بھگتے اور اللہ بھٹی سے گزر کر پا کر وصف ہونے کے بعد رحمت و نعمت اللہ سے بہرہ مند ہوں گے۔

صرف ایک گروہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے باقی رہ جائے گا جو حق کے خلاف اپنی دشمنی اور ہٹ دھرمی، ظلم و فساد اور بے حد نفاق کی وجہ سے سرتاپ اکفر اور بے ایمانی کی گہری تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ جہنم کی دلائی سزا کو بعض افراد نے کیا نکر عدل اللہ کے خلاف شمار کیا ہے؟

۲۔ کیا آخرت کی سزا نیں اس دنیا کی سزاویں کے مانند ہیں؟ اگر نہیں تو وہ سزا نیں کیسی ہیں؟

۳۔ کیا عدالت، گناہ کی مدت اور سزا کی مدت برابر ہونے کا تقاضا کرتی ہے؟

۴۔ دوزخ کی دامنیں کن لوگوں کے لئے ہیں؟

۵۔ عقولی سے کون لوگ بہرہ مند ہوں گے؟

نبوت

کے

دس سبق

## پہلا سبق

رہبران الٰہی کی ضرورت

ہمارے علم و دانش کی محدودیت

ممکن ہے بعض لوگ یہ سوچیں کہ کیا اصولی طور پر خدا کی طرف سے لوگوں کی راہنمائی کے لئے انبیاء کا مجموعہ ہونا ضروری ہے؟ کیا ہماری عقل و شعور حقائق کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے؟ کیا انسان کی علمی ترقی پوشیدہ اسرار کو کشف کرنے اور تمام حقائق کو واضح کرنے کے لئے کافی اور مددگار نہیں ہے؟

جو چیزیں ممکن ہیں انبیاء ہمارے لئے آئیں وہ دو حالتوں سے خارج نہیں ہیں: یا ہماری عقل ان کو بخوبی درک کرتی ہے یاد کر کرنے سے قاصر ہے۔ پہلی صورت میں ہم انبیاء کو تکلیف دینے کے محتاج نہیں ہیں۔ جبکہ دوسری صورت میں ہمیں عقل و خرد کے خلاف مطالب کو قبول کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

دوسرے الفاظ میں: کیا یہ درست ہے کہ انسان اپنے آپ کو مکمل طور پر کسی دوسرے کے اختیار میں دے دے اور اس کی بات کو کسی چون وچرا کے بغیر قبول کرے؟ کیا انبیاء ہمارے جیسے انسان نہیں ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اپنے آپ کو اپنے جیسے انسانوں کے اختیار میں دے دیں؟

جواب

چند نکات کی طرف توجہ کرنے سے ان تمام سوالات کے جواب اور انسان کی زندگی کے نظام میں انبیاء کا مرتبہ واضح ہو جائے گا۔ ہمیں جانتا چاہئے کہ ہمارا علم و شعور محدود ہے۔ بشر کو نصیب ہوئی تمام علمی ترقی کے باوجود آج جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ ہمارے نہ جانے کے مقابلہ میں ایک سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ اور ایک پہاڑ کے مقابلہ ایک ننکے کے مانند ہے۔ یا بعض بڑے دانشوروں کے کہنے کے مطابق جو بھی علوم آج ہمارے اختیار میں ہیں وہ کائنات کی کتاب ہستی کے الف با کے برابر ہیں۔

دوسرے الفاظ میں: ہمارے فیصلہ اور عقلی اور اک کا اکرہ ایک چھوٹے سے علاقہ کے مانند ہے کہ علم و دانش کی شعاعوں نے اسے روشن کیا ہے اور ہم اس کے باہر کی دنیا سے بالکل بے خبر ہیں۔

انبیاء آتے ہیں اور اس و سیع علاقہ کو ہماری ہر ضرورت کی حد تک روشن کرتے ہیں۔ حقیقت میں ہماری عقل ایک قوی اور تیز روشنی والے یہ پ کے مانند ہے، لیکن انبیاء اور آسمانی وحی کی مثال تمام عالم کو روشن کرنے والے سورج کے مانند ہے۔ کیا ایک قوی اور تیز روشن یہ پ رکھنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں سورج کا محتاج نہیں ہوں؟!

واضح تر عبارت میں: زندگی کے مسائل کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ”معقول“، ”غیر معقول“ اور ”مجہول“۔

انبیاء ہر گزنا معقول بات، یعنی عقل و خرد کے خلاف نہیں کہتے اور اگر ایسی بات کہیں تو وہ انبیاء نہیں ہیں۔ وہ مجموعات کو سمجھنے اور درک کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں اور یہ بات ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

امذواہ افراد جو زمانہ ماضی میں کہتے تھے کہ عقل و خرد کے ہوتے ہوئے ہم انبیاء کے محتاج نہیں ہیں، (جیسے برہمن جو ہندوستان اور بعض دیگر علاقوں میں رہتے ہیں) یا وہ لوگ جو آج یہ کہتے ہیں کہ ان تمام علمی ترقیوں اور کامیابیوں کے بعد انسان انبیاء اور ان کی تعلیمات کا محتاج نہیں ہے، تو وہ نہ انسان کے علم و دانش کی وسعت سے باخبر ہیں اور نہ انبیاء کی رسالت کا دراک رکھتے ہیں۔

ان لوگوں کی مثال اس پچے کی ہی ہے جو پہلی جماعت میں الف باپڑ ہنسے کے بعد کہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں اور مجھے معلم و استاد کی ضرورت نہیں ہے، کیا اس کی یہ بات بے نیاد نہیں ہے؟

انبیاء صرف معلم ہی نہیں ہیں، ان کی رہبری کا مسئلہ ایک مستقل بحث کا حامل ہے کہ بعد میں ہم اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

۲۔ کوئی یہ نہیں کہتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو مکمل طور پر اپنے ہی جیسے کسی شخص کے اختیار میں دے دے۔ اصل بات یہ ہے کہ انبیاء جیسا کہ ہم بعد میں ثابت کریں گے۔ وحی الٰہی یعنی خداوند متعال کے لامحدود علم سے رابط رکھتے ہیں اور ہمیں چاہئے کہ قطعی دلائل کے ساتھ خداوند متعال سے ان کے رابطہ کو پہچانیں، صرف اسی صورت میں ہم انبیاء کی باتوں کو نہ صرف قول کریں گے بلکہ ان کی تعلیمات پر دل و جان سے عمل بھی کریں گے۔  
اگر میں ایک ماہر اور ہمدرد طبیب ہیں۔

اگر ہم نے اپنے معلم و استاد کے درس کو، جو ہماری عقل و فکر کے مطابق ہے، کو قبول کریں تو کیا ہم نے غلط کام کیا ہے؟ انبیاء بشریت کے سب سے بڑے معلم ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ ہم خدا کی طرف سے انبیاء کی بعثت کی ضرورت کے دلائل پر مزید دقت کے ساتھ بحث کریں۔  
ہمارے پاس تین ایسی واضح اور محکم دلیلیں موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم انبیاء کی راہنمائی کے محتاج ہیں:  
۱۔ تعلیم کے اعتبار سے احتیاج

اگر ہم نور کی ایک خیالی اور افسانوی سواری پر سوار ہو کر تین لاکھ کیلو میٹر (بچاہ ہزار فرسخ) فنی سینڈ کی رفتار سے اس لامحدود کائنات کی سیر کریں تو کسی شک و شبہ کے بغیر ہمیں حضرت نوحؐ کی عمر جیسی ہزاروں عمریں درکار ہوں گے تاکہ ہم اس وسیع و عریض کائنات کے صرف ایک گوشے کا نظارہ کر سکیں۔

یہ کائنات اپنی ان تمام حیرت انگیزوں سمعتوں کے ساتھ یقیناً عبث اور فضول نہیں بنائی گئی ہے اور جیسا کہ ہمیں توحید کے اس باقی میں معلوم ہوا ہے کہ اس کائنات کا کوئی بھی فائدہ یا نفع خداوند متعال کے لئے نہیں ہے کیونکہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو ہر لحاظ سے کامل، بے نیاز، لامحدود اور ہر نقص و عیب سے پاک ہے۔ اس کائنات کو اس لئے نہیں بنایا ہے کہ اپنے کسی نقص کو برو طرف کرے۔

اس لئے ہم یہ نتیجہ لیتے ہیں کہ خداوند متعال کا مقصد یہ ہے کہ دوسروں پر جودو کرم کرے اور تمام موجودات کو مکمل تک پہنچا دے، جیسے سورج جو ہم زمین والوں پر چکلتا ہے حالانکہ وہ ہمارا محتاج نہیں ہے۔ سورج کی یہ روشنی صرف ہمارے فائدے کے لئے ہے ورنہ ہم سورج کے لئے کون سی خدمت

انجام دے سکتے ہیں۔

کیا ہمارے لئے رشد و تکامل کی راہ کو طے کرنے اور انسان کامل کے مرحلہ تک پہنچنے کے لئے صرف ہماری معلومات کافی ہیں؟

ہم اس کائنات کے اسرار اور موزیں سے کتنے اسرار کے بارے میں آگاہ ہیں؟ بنیادی طور پر ہماری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کائنات کب سے وجود میں آئی ہے؟ کوئی بھی شخص ان سوالات کے صحیح اور دقیق جوابات نہیں جانتا۔ یہ کائنات کب تک باقی رہے گی؟ اس کا جواب بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ اجتماعی اور اقتصادی زندگی کے لحاظ سے بھی ہر دانشور اپنا ایک خاص نظریہ رکھتا ہے۔

مثلاً ایک گروہ ”سرمایہ داری“ نظام کا قائل ہے جبکہ دوسرا گروہ ”سو شلزم“ اور ”کیو نزم“ کے نظریات کا حامی ہے اور تیسرا گروہ نہ پہلے کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو بلکہ دونوں گروہوں کے نظریات کو نقصان دہ جان کر مسترد کرتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے دیگر مسائل میں بھی دانشوروں کے نظریات میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔

انسان حیران و پریشان ہو جاتا ہے کہ ان نظریات میں سے کس نظریہ کو قول کرے؟!

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس بات کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ خلقت کے بنیادی اور حقیقی مقصد یعنی ”انسان کی تمام جہات میں پورش، بالیدگی اور مکالم“ کی منزل تک پہنچنے کے لئے ایسی تعلیمات کی ضرورت ہے جو صحیح اور حقیقی ہوں اور ہر قسم کی خطاؤں سے پاک اور زندگی کے حقائق کے مطابق ہوں، ایسی تعلیمات جو اس طویل راہ میں اصلی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے انسان کی مددگاری ثابت ہو سکیں۔

اور یہ سب کچھ صرف علم خدا یعنی انبیاء کے ذریعہ حاصل ہونے والی الٰہی وحی سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے جس خدائے ہمیں اس کو طے کرنے کے لئے پیدا کیا ہے، ضروری ہے کہ وہ ایسا علم و دانش بھی ہمارے اختیار میں قرار دے۔

## ۲۔ اجتماعی اور اخلاقی مسائل میں رہبری کی احتیاج

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے وجود میں ”عقل و خرد“ کے علاوہ ایک اور قوت بھی موجود ہے کہ جس کا نام ”غراائز اور خواہشات“ ہے: خود پرندی کا غریزہ، خشم و غصب کا غریزہ، شہوت کا غریزہ اور اس قسم کے بہت سے دیگر غراائز اور خواہشات۔

بیشک اگر ہم اپنے غراائز کو قابو میں نہ رکھیں تو وہ ہم پر مسلط ہو جائیں گے حتی ہماری عقل و خرد کو بھی اسیرنالیں گے اور انسان تاریخ کے ظالموں اور جاہروں کی طرح ایسے بھیڑیے کی شکل اختیار کر لے گا جو ہر اعتبار سے جنگل کے بھیڑیوں سے بھی زیادہ خطرناک ہو گا۔

ہم اخلاقی تربیت کے لئے ایک تربیت کرنے والے استاد کے محتاج ہیں، ہم ایک ”نمونہ“ اور ”اسوہ“ کے محتاج ہیں تاکہ ”محاکات“ کے اصول کے مطابق اس کی گفتار و فقار پر عمل کر سکیں۔

یہ ضروری ہے کہ ہر لحاظ سے ایک کامل اور تربیت یافتہ انسان اس خطرناک اور نشیب و فراز سے پر راستے میں ہمارا ہاتھ پکڑ لے اور ہمیں غراائز و خواہشات کے طغیان سے بچائے، اخلاقی فضائل کے اصولوں کو اپنے کردار و عمل سے ہمارے دل و جان میں نقش کر دے اور ہماری روح میں شجاعت، شہامت، انسان دوستی، مروت، عفو و بخشش، وفاداری، سچائی، امانت داری اور پاک دائمی کو پروان چڑھائے۔

معصوم انبیاء کے علاوہ کون ہمارا ایسا مرتبی اور راہنمائی سکتا ہے؟

اسی دلیل کے پیش نظر ممکن نہیں ہے کہ ہمارا ہمارا اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا خدا ہمیں ایسے راہنماؤں سے محروم رکھے۔ (اس بحث کا باقی حصہ

آئندہ سبق میں بیان ہو گا)

### غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ کیا آپ یہ احساس کرتے ہیں کہ آپ کا علم و دانش جس قدر بھی زیادہ ہو جائے آپ کی جہالت آپ کے علم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے؟ (مثال دیجئے)
- ۲۔ کیا آپ انہی تقلید اور انبیاء کی پیروی کے درمیان فرق کی وضاحت کر سکتے ہیں؟
- ۳۔ اگر ہم کسی نامعلوم راستے پر راہنمای بغایر چلیں تو ہمیں کن مکانہ خطرے کا سامنا پڑ سکتا ہے؟
- ۴۔ ہم انبیاء کی رہبری کے کس قدر اور کس لحاظ سے محتاج ہیں وضاحت کیجئے۔
- ۵۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ اس سبق میں کون سا مطلب باقی رہا ہے جو آئندہ سبق میں بیان کیا جائے؟

## دوسرा سبق

قانون گزاری کے لئے انبیاء کی ضرورت

ہم گزشتہ درس میں ”تعلیم“ اور ”تریت“ کے حوالے سے انبیاء کی ضرورت کے بارے میں جان چکے ہیں۔ اب اجتماعی قوانین اور اس سلسلہ میں انبیاء

کے اہم روپ بحث کریں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت جو اس کی ترقی کا سبب بنی ہے اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں مشہود ہے، اس کی وہی پر تلاش اجتماعی زندگی ہے۔

یقیناً اگر تمام انسان ایک دوسرے سے الگ تھلگ زندگی بس رکرتے تو تہذیب و تمدن اور فکری لحاظ سے آج وہ سب ”عصر حجر“ کے انسان جیسے ہوتے! جی ہاں! یہ انسان کی اجتماعی تلاش و کوشش ہی ہے، جس نے تہذیب و تمدن کا چراغ جلایا ہے، یہی اجتماعی تلاش و کوشش ہے جو انسان کی تمام علمی ایجادات اور اکتشافات کا سبب بنی ہے۔

مثال کے طور پر اگر ہم چاند تک پہنچنے کے سفر کے مسئلہ پر غور کریں، تو معلوم ہو گا کہ یہ کام صرف ایک یا چند انسوروں اور سائنسدانوں کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ ہزاروں برسوں کے دوران لاکھوں علماء اور انسوروں کے اجتماعی مطالعات، اکتشافات اور تجربیات کا نتیجہ ہے کہ انسان اس عظمت تک پہنچا ہے۔

اگر ہمارے زمانہ میں ایک ماہر سرجن ایک مردہ انسان کے قابل استفادہ دل کو نکال کر دوسرے قریب المrg انسان کے سینہ میں پیوند لگاتا ہے اور اسے قطعی موٹ سے نجات دلاتا ہے، تو یہ پوری تاریخ کے ہزاروں طبیبوں اور جراحوں کے تجربوں کا نتیجہ ہے جو استادوں کے ذریعہ شاگروں کو منتقل ہوتا رہا ہے۔

لیکن اس اجتماعی زندگی میں ان تمام فوائد کے باوجود کچھ مشکلات بھی ہیں، اور وہ مشکلات انسانوں کے ایک دوسرے کے حقوق اور منافع کا آپس میں متصادم ہونا ہے جو کبھی حق تلقی اور جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

یہاں پر قوانین، نظام اور قواعد و ضوابط کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ قوانین ہماری تین بڑی مشکلات کو حل کر سکتے ہیں:

۱۔ قانون معاشرے کی نسبت ہر فرد کے اختیارات اور ذمہ داریوں کو اور ہر فرد کی نسبت معاشرے کی ذمہ داریوں اور فرائض کو واضح کرتا ہے، اور قابلیتوں کو بالیدگی اور کوششوں کو مر بوٹ کرنے کا سبب بنتا ہے۔

۲۔ قانون لوگوں کے فریضوں اور ذمہ داریوں کی انجام دہی پر ضروری نگرانی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

۳۔ قانون لوگوں کو ایک دوسرے کے حقوق کو پہاڑ کرنے سے روکتا ہے اور معاشرے کو ہر جو درج اور مختلف افراد اور گروہوں کے درمیان تصادم سے بچاتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر زیادتی کرنے والوں کے لئے مناسب سزاوں میں معین کرتا ہے۔

بہترین قانون ساز کون ہے؟

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ انسان کی ضرورت کے مطابق قانون سازی میں مذکورہ تین اصولوں کے ساتھ بہترین قوانین مرتب و منظم کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ تاکہ معاشرے کے افراد اور خود معاشرہ کے اختیارات، فرائض اور حقوق واضح اور معین ہو جائیں اور لوگوں کے اعمال پر کامل نگرانی کے علاوہ ظلم و زیادتی کرنے والوں کو بھی روکا جاسکے۔

اس سلسلہ میں ہم یہاں پر ایک واضح مثال پیش کرتے ہیں:

انسانی معاشرہ کو ایک بڑی ٹرین اور حکمران طبقہ کو اسے چلانے اور حرکت میں لانے والے انہیں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

قانون اس ریلوے لائے کی پڑی کے اندر ہے جو اس ریل گاڑی کو منزل مقصود تک پہنچنے کے راستہ کو معین کرتی ہے۔

پہاڑوں اور دروں کے مختلف پیچ و خم سے گزرنے والی ایک اچھی ریلوے لائے کے لئے درج ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ جس زمین سے ٹرین کو گزرنा ہے، اس میں اس کے زیادہ سے زیادہ دباؤ کو برداشت کرنے کی طاقت ہونی چاہئے۔

۲۔ ریل کی دوپٹیوں کے درمیان کافاصلہ کامل طور پر ٹرین کے پیسوں کے موافق اور ہماهنگ ہونا چاہئے اور اسی طرح ٹنلوں کی دیواریں اور ان کی بلندی ٹرین کی بلندی کے مطابق ہونی چاہئے۔

۳۔ نشیب و فراز اتنے گہرے اور اونچے نہ ہوں کہ ٹرین کے بریکوں اور اس کے جاذبہ کی قوت کو برداشت نہ کر سکیں۔

۴۔ اسی طرح ٹرین کے گزرنے کے راستے پر پہاڑوں سے پتھروں کے گرنے، سیلاں اور برف کے تدوں کے گرنے کو کامل طور پر مد نظر رکھنا چاہئے تاکہ ٹرین صحیح و سالم ان رستوں سے گزر کر منزل مقصود تک پہنچ سکے۔ اسی طرح اور دوسرے خصوصیات بھی اس زمین میں پائے جانے چاہئیں۔ اس مثال کو بیان کرنے کے بعد ہم پھر انسانی معاشرہ کی بحث کی طرف لوٹتے ہیں۔

انسانوں کے لئے بہتریں قانون بنانے والے قانون ساز کو مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے:

۱۔ نوع انسان کو کامل طور پر پہچانتا ہو اور ان کے تمام غرائز، خواہشات، جذبات، ضروریات اور مشکلات سے آگاہ ہو۔

۲۔ انسانوں میں پائی جانے والی تمام صلاحیتوں اور قوانین کو مد نظر رکھئے اور ان کو اجاگر کرنے کے لئے قوانین سے استفادہ کرے۔

۳۔ معاشرے کو ممکنہ طور پر پیش آنے والے ہر قسم کے حوادث اور ان کے رد عمل کے بارے میں قبل از وقت پیش گوئی کر سکے۔

۴۔ معاشرہ سے اس کے کسی بھی قسم کے منافع مربوط نہ ہوں تاکہ قوانین وضع کرتے وقت اس کی فکر خود اپنے شخصی یا اپنے رشتہ داروں یا اپنی جماعت کے منافع کی طرف متوجہ نہ رہے۔

۵۔ ضروری ہے کہ یہ قانون بنانے والا مستقبل میں انسان کو حاصل ہونے والی ہر قسم کی ترقی یا تنزل سے کامل طور پر آگاہ ہو۔

۶۔ یہ قانون ساز ہر قسم کی خطا، غلطی اور فراموشی سے محفوظ ہونا چاہئے۔

۷۔ یہ قانون ساز ایسی طاقت کا مالک ہونا چاہئے کہ معاشرے کے کسی فرد کی طاقت کے مقابلہ میں مرعوب نہ ہو جائے اور کسی سے نہ ڈرے اور اس کے ساتھ ہی نہایت مہربان اور ہمدرد ہونا چاہئے۔

یہ شرائط کسی میں جمع ہیں؟

کیا انسان بہترین قانون ساز ہو سکتا ہے؟

کیا آج تک کسی نے کامل طور پر انسان کو پہچانا ہے؟ جبکہ عصر حاضر کے ایک بڑے دانشمند انسان کے بارے میں ایک مفصل کتاب لکھی ہے اور اس کا نام ”انسان، موجود ناشناختہ“ (انسان ایک ناشناختہ مخلوق) رکھا ہے۔

کیا انسان کی ذہنیت، میلانات، غرائز اور جذبات کو کامل طور پر پہچان لیا گیا ہے؟

کیا انسان کی جسمانی اور روحانی ضروریات کو خداوند متعال کے علاوہ کوئی اور شخص جانتا ہے؟

کیا عام انسانوں میں کوئی ایسا شخص پایا جاسکتا ہے جو معاشرے میں خاص ذاتی منافع نہ رکھتا ہو؟

کیا آپ عام انسانوں کے درمیان کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جو سہو و خطا سے محفوظ ہوا اور معاشرے کے تمام افراد کو در پیش مسائل سے آگاہ ہو؟ لہذا خداوند متعال کی ذات اور خدا سے وحی حاصل کرنے والی ہستی (معصوم) کے علاوہ کوئی بھی شخص کامل اور بہترین قانون ساز نہیں ہو سکتا ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں: جس خداوند متعال نے انسان کو کمال کے مراحل طے کرنے کے لئے پیدا کیا ہے، اسے چاہئے کہ اس کی ہدایت کے لئے ایسے افراد کو مامور فرمائے جو تمام الٰی قوانین کو انسان کے اختیار میں دے دیں۔

یقیناً جب لوگ جان لیں گے کہ فلاں قانون، خدا کا قانون ہے تو وہ اسے زیادہ اعتماد اور اطمینان سے قبول کر کے اس پر عمل کریں گے اور دوسرے الفاظ میں یہ آگاہی ان قوانین کے بہترین نفاذ کی ضمانت فراہم کرے گی۔

توحید و نبوت کے درمیان رابطہ

ہم یہاں پر اس مطلب پر توجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ نظام خلقت بذات خود انیمیٰ الٰی اور ان کی رسالت کے وجود پر ایک زندہ گواہ ہے۔ اس مطلب کی وضاحت یہ ہے: اگر ہم کائنات کے جیرتِ الگنیز نظام پر ایک تحقیقی نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ خداوند متعال نے اپنی مخلوقات کی کسی بھی ضرورت کو اپنے لطف و کرم سے محروم نہیں رکھا ہے۔ مثلاً اگر اس نے ہمیں دیکھنے کے لئے آنکھیں عطا کی ہیں تو ان کی حفاظت اور روشنی کو مناسب طور پر تنظیم کرنے کے لئے پلکلیں اور بھنویں بھی عطا کی ہیں۔

آنکھوں کے گوشوں میں آنسوؤں کے غدو و خلق کئے ہیں تاکہ آنکھوں کو مرطوب رکھیں، کیونکہ آنکھوں کا خشک ہونا ان کی نابودی کا سبب بن سکتا ہے۔ آنکھ کے گوشوں میں باریک سوراخ بنائے ہیں تاکہ آنکھوں کا اضافی پانی ان سوراخوں کے ذریعہ ناک میں داخل ہو جائے۔ اگریہ باریک سوراخ نہ ہوتے تو آنسوؤں کے قطرے مسلسل ہمارے چہرے پر بہتے رہتے!

آنکھ کی پتیلی کو اس قدر حساس بنایا ہے کہ وہ خود بخود تیزیاً کم روشنی کے مقابلہ میں تنگ آشادہ ہو جاتی ہے، تاکہ ضرورت کے مطابق آنکھ میں روشنی داخل ہو جائے اور آنکھ کو کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچے۔

آنکھ کے حلقة کے اطراف میں ایسے مختلف پٹھے بنائے ہیں تاکہ سر اور بدن کو ہلائے بغیر آنکھ کو آسانی کے ساتھ ہر طرف گھما کر مختلف مناظر کو دیکھا جاسکے۔

وہ خدا جو انسان کی مختلف ضروریات کا اس قدر خیال رکھتا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اسے ایک معصوم اور قابل اعتماد رہنماء اور رہبر سے محروم رکھے جو وحی الٰی کے ذریعہ را ہنمائی کرتا ہو؟!

مشہور و معروف فلاسفہ بولی سینا اپنے کتاب ”شفا“ میں یوں لکھتا ہے:

”انسان کے لئے اپنی بقا کے تحفظ اور کمال حاصل کرنے کی ضرورت کے پیش نظر انیمیٰ کا مجموع ہونا یقیناً پلکوں اور بھنوؤں کے بال اگنے اور پاؤں کے تلوؤں میں خمیدگی جیسی چیزوں سے زیادہ ضروری ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ خداوند متعال اپنی ازلی عنایت کے تقاضے کی بنابری مذکورہ ضروری چیزوں کو پیدا کرے لیکن ان سے زیادہ ضروری چیز کو پیدا نہ کرے؟“

## غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ انسان کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟
- ۲۔ انسان قانون کے بغیر زندگی کیوں نہیں گزار سکتا ہے؟
- ۳۔ انسانی زندگی میں قانون کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ایک زندہ مثال بیان کیجئے۔
- ۴۔ ایک بہترین قانون ساز کے لئے کن صفات کا ہونا ضروری ہے؟
- ۵۔ انبیاء کا خود انسانوں میں سے ہونا کیوں ضروری ہے؟

## تیسرا سبق

انبیاء کیوں مخصوص ہیں؟

گناہ و خطای سے پاک ہونا

بلاشک و شبہ ہر نبی کے لئے ہر چیز سے پہلے تمام لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ لوگ اس کی بات کے بارے میں جھوٹ اور غلطی کا احتمال نہ کر سکے۔ اس کی رہبری کا منصب متزلزل ہو جائے گا۔

اگر انبیاء مخصوص نہ ہوں تو بہانہ تراشی کرنے والے اس وجہ سے کہ انبیاء غلطی کرتے ہیں اور حقیقت پسند لوگ ان کی دعوت کی باتوں میں غیر یقینی حالت کی وجہ سے ان کی دعوت کو قبول کرنے سے اجتناب کریں گے یا کم از کم اعتماد و اطمینان کے ساتھ ان کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے۔

اس دلیل کو ہم ”اعتماد کی دلیل“ کہہ سکتے ہیں اور یہ عصمت انبیاء کے دلائل میں سے ایک اہم دلیل ہے۔

دوسرے الفاظ میں: یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند متعال ایک انسان کی بلا قید و شرط اطاعت کرنے کا حکم دیدے جبکہ ممکن ہے وہ انسان خطاو گناہ کا مر تک بہو جائے؟ کیا اس حالت میں لوگ اس کی اطاعت کر سکتے ہیں؟ اگر وہ اطاعت کریں تو ان کی اطاعت خطاو گناہ کی پیروی ہو گی اور اگر اطاعت نہ کریں تو اس کی رہبری کا منصب متزلزل ہو گا، خاص کر جبکہ انبیاء کی رہبری دوسروں کی رہبری سے مکمل طور پر متفاوت ہے، کیونکہ لوگ اپنے تمام اعتقادات اور زندگی کے اصول و قوانین میں ان ہی انبیاء سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب عظیم مفسرین قرآن مجید کی آیہ شریفہ:

”اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر ممکن“

(سورہ نساء، ۵۹)

”اللہ کی اطاعت کرو اور رسول و صاحبان امر کی اطاعت کرو۔“

پر پچھتے ہیں تو کہتے ہیں: کس قید و شرط کے بغیر اطاعت کرنے کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ نہ صرف انبیاء مخصوص ہیں بلکہ ”اولی الامر“ بھی مخصوص ہیں۔ اولو الامر سے مقصود وہ ائمہ ہیں جو پیغمبرؐ کی طرح مخصوص ہیں و گرنہ خداوند متعال بے قید و شرط ان کی اطاعت کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ ایک دوسرا طریقہ، جس سے انبیاء کے ہر گناہ کے مقابلہ میں مخصوص ہونے کو ثابت کیا جاسکتا ہے، یہ ہے کہ ”انبیاء کے وجود میں گناہ کے عوامل و اسباب کا میاب نہیں ہوتے ہیں۔“

اس کیوضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ جب ہم اپنے اندر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہم بھی بعض گناہوں یا برے کاموں کے مقابلہ میں تقریباً مخصوص ہیں۔

درج ذیل مثالوں پر غور فرمائیے:

کیا آپ کسی ایسے عاقل انسان کو پیدا کر سکتے ہیں جو آگ کو کھالے؟ یا کوڑا کر کت اور کسی گندی چیز کو نگل لے؟

کیا آپ کسی باشمور کو بالکل بہنہ ہو کر گلیوں اور بازاروں میں گھومتے ہوئے پیدا کر سکتے ہیں؟

یقیناً کسی باشمور انسان کو ایسا کام کرتے ہوئے پیدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم کسی شخص کو ایسا کرتے دیکھیں تو یقین پیدا کریں گے کہ اس کا داماغِ ٹھیک نہیں ہے اور وہ کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے ورنہ عام طور پر محال ہے کہ کوئی عاقل شخص اس قسم کا کوئی کام انجام دے۔

جب ہم اس قسم کے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے اعمال کی برائی ہمارے لئے اس قدر واضح ہے کہ کوئی بھی عاقل انسان ان کاموں کا مرتب نہیں ہو سکتا۔

یہاں پر ہم ایک مختصر جملہ میں اس حقیقت کو مجسم کر کے بتاسکتے ہیں کہ ہر عاقل اور صحیح و سالم شخص بعض بُرے اور ناشائستہ کاموں کی نسبت "محفوظ" یادو سرے الفاظ میں ایک طرح "معصوم" ہوتا ہے۔

اس مرحلہ سے آگے بھی ہم بعض ایسے اشخاص کو پاتے ہیں جو کئی دوسرے برے کاموں کے مقابلہ میں بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں جبکہ عام لوگوں سے ایسا ممکن نہیں ہے۔

مثال کے طور پر ایک آگاہ اور ماہر طبیب جو جرا شیم کے مختلف انواع و اقسام کو بخوبی جانتا ہے، ہر گز ایسے آلوہ پانی کو نہیں پیتا جس میں خطرناک متعدد بیماریوں میں مبتلا بیماروں کے کپڑے دھوئے گئے ہوں، جبکہ ممکن ہے ایک ان پڑھ اور نا آگاہ شخص اس قسم کی چیز کو اہمیت نہ دے۔

بہر حال ہم ایک سادہ تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک موضوع کے بارے میں جس قدر انسان کی آگاہی زیادہ ہو وہ برے کاموں سے زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے۔

اس حساب سے اگر کسی کے "ایمان" اور "علم و آگاہی" کی سطح اس قدر بلند ہو جائے کہ وہ خداوند متعال اور اس کی عدالت کے بارے میں ایسا اعتقاد و یقین پیدا کرے کہ گویا انھیں اپنی آنکھوں کے سامنے حاضر و ناظر مشاہدہ کر رہا ہے، تو ایسا انسان تمام گناہوں کے مقابلہ میں محفوظ رہے گا اور اس کے سامنے ہر برآ کام و بیانی ہو گا، جیسا ہماری نظر وہ میں کوچہ و بازار میں مادرزاد ننگا گھومنا ہے۔

اس کے لئے حرام مال بالکل آگ کے شعلہ کے مانند ہو گا، جس طرح ہم آگ کو اپنے منہ میں نہیں ڈالتے، وہ بھی حرام مال کو اپنے منہ کی طرف نہیں لے جاتا ہے۔

اس ننگلگو سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ انبیاء اپنے غیر معمولی علم و آگاہی کے پیش نظر گناہ کے عوامل پر کمزول رکھتے ہیں اور گناہ کے پیش نظر اگر نہیں تو یہ انسان اگر نہیں ہو سکتے، اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ انبیاء معصوم ہیں اور ہر قسم کے گناہوں سے پاک و منزہ ہیں۔

عصمت کا مرتبہ کیسے فضیلت کا سبب بن سکتا ہے؟

بعض افراد جو عصمت کے مفہوم اور گناہوں سے بچنے کے عوامل کے بارے میں

آگاہی نہیں رکھتے، اعتراض کرتے ہیں کہ اگر خداوند متعال کسی کو گناہ سے بچانے اور گناہ کے عوامل کو اس میں ختم کر دے تو یہ اس کے لئے کوئی فضیلت نہیں ہو سکتی ہے! کیونکہ یہ ایک جری عصمت ہے اور جری عصمت فضیلت شمار نہیں ہوتی

لیکن ہماری مندرجہ بالاوضاحت کے پیش نظر اس اعتراض کا جواب کامل طور پر واضح ہو گیا ہے:

انمیاء کی عصمت میں کسی بھی قسم کا اجباری پہلو نہیں ہے بلکہ ان میں موجود قوی ایمان، محاکم اور غیر معمولی علم و آگاہی ان کے لئے عصمت کی ایک عظیم فضیلت حاصل ہونے کا سبب بنتے ہیں۔

اگر ایک آگاہ و ماہر طبیب بیماری پھیلانے والے عوامل کے مقابلہ میں شدید پر ہیز کاظم اور کرے تو کیا یہ اس کی مجبوری شمار کی جائے گی؟!

اگر ایسا شخص حفظان صحت کے اصولوں کی پوری طرح رعایت کرے تو کیا یہ کام اس کی ایک فضیلت شمار نہیں ہو گی؟

اگر ایک قانون دان کسی خطرناک جرم کے عدالت میں ہولناک نتائج کے پیش نظر اس سے سخت پر ہیز کرتا ہے تو کیا یہ اس کی فضیلت شمار نہیں ہو گی؟

پس ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انمیاء کے معصوم ہونے میں نہ صرف اختیاری پہلو ہے بلکہ یہ ان کے لئے ایک بڑی فضیلت بھی ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ معصوم ہونے کی کتنی قسمیں ہیں؟

۲۔ اگر انمیاء معصوم نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟

۳۔ مرتبہ ”عصمت“ کی حقیقت کیا ہے؟

۴۔ سابق میں بیان شدہ مثالوں کے علاوہ چند اور مثالیں بیان کیجئے جن کی نسبت تمام لوگ یا کچھ لوگ معصوم ہوں۔

۵۔ انمیاء کی عصمت اجباری ہے یا اختیاری؟ دلیل بیان کیجئے۔

## چو تھا سبق

پیغمبر شناسی کا بہترین طریقہ

بلاشک و شبہ ہر مدعا کے دعویٰ کو قبول کرنا عقل و منطق کے خلاف ہے۔

ممکن ہے خدا کی طرف سے پیغمبری اور رسالت کا دعویٰ کرنے والا شخص سچا ہو، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایک موقع پرست اور دھوکہ باز شخص سچے انیاء کے بجائے جھوٹا دعویٰ کرے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انیاء کی دعوت اور ان کے خدا سے رابطہ کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے، ہمارے پاس ایک قطعی اور یقینی کسوٹی موجود ہو۔

اس مقصد تک پہنچنے کے لئے ہمارے پاس مختلف راستے موجود ہیں، جن میں سب سے اہم مندرجہ ذیل دراستے ہیں:

- ۱۔ پیغمبر کی دعوت کے مطالبے کے بارے میں پوری وقت سے تحقیق اور اس کے بارے میں قرآن و علامات کو اکھڑا کرنا۔
- ۲۔ مجذہ اور خارق العادہ کام۔

ہم پہلے مجذہ کے بارے میں بحث کرتے ہیں:

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لفظ ”مجذہ“ سن کر تجب کاظہار کرتے ہیں یا مجذہ کو افسانوں اور کہانیوں کے مثل جانتے ہیں، حالانکہ اگر ہم مجذہ کے معنی و مفہوم پر سنجیدگی کے ساتھ اور علمی پہلو سے غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کے تصورات بالکل غلط ہیں۔

حقیقت میں مجذہ ایک ناممکن کام اور بے علت معلول نہیں ہے، بلکہ سادہ الفاظ میں مجذہ ایک خارق عادت کام کو کہتے ہیں جس کو انجام دینا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں ہوتی اور یہ صرف ایک غیر معمولی طاقت کے ذریعہ ہی انجام پاسکتا ہے۔

اس لئے مجذہ کے درج ذیل شرائط ہیں:

- ۱۔ یہ ایک ممکن اور قابل قبول کام ہے۔
- ۲۔ عام لوگ، حتیٰ غیر معمولی ذہن رکھنے والے افراد بھی انسانی قدرت کے ذریعہ مجذہ کو انجام دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔
- ۳۔ مجذہ پیش کرنے والے شخص کو اپنے کام پر اتنا تلقین اور اطمینان ہونا چاہئے کہ دوسروں کو اس کے مقابلہ کی دعوت کرے۔
- ۴۔ کوئی بھی شخص مجذہ کے مانند کام انجام نہیں دے سکتا ہے، جیسا کہ مجذہ کے نام ہی سے معلوم ہے کہ اس کے مقابلہ میں لوگ عاجز ہوں۔
- ۵۔ مجذہ کا نبوت یا امامت کے دعویٰ کے ساتھ ہونا ضروری ہے (اس لئے پیغمبر اور امام کے علاوہ دوسروں سے انجام پانے والے خارق عادت کام مجذہ نہیں کھلاتے بلکہ انھیں کرامت کہا جاتا ہے)۔

پنڈوا شخص نمونے :

ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مججزات میں سے ایک مجرہ مردوں کو زندہ کرنا اور لاعلاج مریضوں کو صحت یاب کرنا تھا۔ کیا ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل موجود ہے جس سے یہ ثابت کریں کہ انسان کے بدن کا نظام فیل ہو کر مرنے کے بعد پھر سے وہ زندہ نہیں ہو سکتا ہے؟! کیا ہمارے پاس کوئی ایسی عقلیٰ و علمی دلیل موجود ہے جس سے ہم ثابت کریں کہ کینسر کی بیماری، جس کے علاج سے ہم عاجز ہیں، کا کوئی علاج نہیں ہے۔ لیکن یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسان موجودہ قدرت اور حالات میں مردوں کو زندہ کرنے یا بعض بیماریوں کا علاج کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے، چاہے دنیا کے تمام ڈاکٹر مل کر اپنے تجربات اور علم سے مدد کیوں نہ لیں۔ لیکن اس میں کیا مشکل ہے کہ ایک انسان خدا کی قدرت اور اس کے لامحدود علم کے سمندر سے آگاہی حاصل کر کے ایک پراسرار اشارہ کے ذریعہ ایک مردہ میں پھر سے روح کو لوٹادے یا ایک لاعلاج مریض کو شفا بخش دے! علم صرف یہ کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا ہوں اور مجھ میں یہ کام انجام دینے کی طاقت نہیں ہے، لیکن کبھی یہ نہیں کہتا ہے کہ فلاں کام انجام دینا ممکن اور غیر معقول ہے۔

ایک دوسرا مثال:

غلائی جہاز کے بغیر چاند کا سفر کرنا کسی بھی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے، لیکن اس میں کیا حرج ہے کہ ہماری قدرت سے برتر کوئی طاقت انسان کی ایجاد کی گئی سواری سے بالآخر ایک پراسرار سواری کو ایجاد کر کے کسی کے اختیار میں قرار دیدے اور وہ غلائی جہاز سے مدد لئے بغیر چاند یا اس سے دور تر سیاروں کا سفر کر دے!

اگر کوئی شخص حقیقتاً اس قسم کا کوئی خارق عادت کام انجام دے اور اس کے ساتھ ہی نبوت کا دعویٰ بھی کرے اور لوگوں کو مقابلہ کی دعوت بھی دے اور عام لوگ اس کے مقابلہ میں عاجز ہو جائیں تو تسلیں کریں گے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔

مججزات کو توهہات اور خرافات سے نہیں ملانا چاہئے

”افرات“ و ”تفریط“ ہمیشہ برائی اور تباہی ایجاد کرنے اور حقیقت کے چہرہ کو بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں۔

مججزہ کے بارے میں بھی یہی امر صادق آتا ہے۔ جبکہ بعض تحدید پندی کے نام نہاد عوے دار کھل کر یا شاروں میں ہر قسم کے مججزہ سے انکار کرتے ہیں اس کے مقابلہ میں کچھ لوگ زیادہ سے زیادہ مججزے گھڑتے ہیں اور مر موزد شنمیوں کے توسط سے جعل کی گئی ضعیف روایتوں اور توهہات پر مشتمل افسانوں کو مججزات کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ اس طرح انبیاء کے حقیقی مجرموں کے علمی چہرے پر افسانوں اور خرافات کے پردے ڈال دیتے ہیں۔

جب تک حقیقی مججزات اس قسم کے جعلی افسانوں سے پاک و منزہ نہ ہو جائیں، ان کا اصلی چہرہ آشکار نہیں ہو گا۔

اسی لئے ہمارے عظیم علماء اور فقہاء ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ مججزات وغیرہ کے سلسلے میں اسلامی احادیث اس قسم کے افسانوں سے آلو دہ نہ ہو جائیں۔

اسی لئے ”علم رجال“ کو وجود میں لا یا گیتا کہ احادیث کے راویوں کو اچھی طرح پر کھا جائے اور ”صحیح“ اور ”ضعیف“ احادیث کے درمیان فرق معلوم کیا

جائے اور توهہات پر مشتمل مطالب حلق سے ملنے پائیں۔

آج سامراجی اور الحادی قوتیں بیکار نہیں بیٹھی ہیں بلکہ وہ بنیاد باتوں کو پاک و منزہ دینی عقائد سے مخلوط کر دینے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ اس طرح سے لوگوں کو حقیقی علم سے دور کر دیں۔ لہذا ضروری ہے کہ ہم دشمنوں کی ان تحریجی ساز شوں کے بارے میں پوری طرح باخبر رہیں اور ان کو ناکام بنادیں۔

### مجزہ کا دوسرا خارق عادت چیزوں سے فرق

غالباً آپ نے سناؤ گا کہ کچھ جو گی بعض اوقات خارق عادت کام انجام دیتے ہیں، ایسے عجیب و غریب کام کا مشاہدہ کرنے والے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے، یہ ایک حقیقت ہے نہ افسانہ۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان خارق عادت کاموں اور ان بیان کے مجذبات کے درمیان کیا فرق ہے؟ ہمارے پاس کوئی کسوٹی ہے جس پر کے ذریعہ ہم ان دو چیزوں کے درمیان فرق معلوم کر سکیں؟

اس سوال کے کئی جواب ہیں، ان میں سے واضح تر درج ذیل دو جواب ہیں:

۱۔ جو گیہیشہ محمد و کام انجام دیتے ہیں اور دوسرے الفاظ میں کوئی بھی جو گی آمادہ نہیں ہو گا کہ آپ کی خواہشی کے مطابق کسی خارق عادت کام کو انجام دے بلکہ وہ ایسا خارق عادت کام انجام دیتا ہے جسے وہ خود چاہتا ہے یعنی اسی کام کو انجام دیتا ہے جس کی اس نے مشق کر کے اچھی طرح سے سیکھا ہے اور اس پر مسلط ہو گیا ہے۔ اس بات کی وجہ واضح ہے، کیونکہ ہر انسان کی قدرت محدود ہے، وہ صرف چند ایک کاموں میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ان بیان کے خارق عادت کام کی کوئی محدودیت نہیں ہے، ان کے لئے کسی قسم کی قید و شرط نہیں ہے۔ وہ ضرورت کے وقت ہر قسم کے مطالبہ شدہ مجذہ کو انجام دے سکتے ہیں، کیونکہ وہ خدا کی لامحدود قدرت سے مدد لیتے ہیں اور معلوم ہے کہ خدا کی قدرت کی کوئی حد نہیں ہے، جبکہ انسان کی قدرت نہایت محدود ہے۔

۲۔ جس کام کو ایک جو گی انجام دیدے، دوسرا جو گی بھی ویسا ہی کام انجام دے سکتا ہے یعنی وہ کام بشرطی قدرت سے باہر نہیں ہے۔ اسی لئے خارق عادت کام انجام دینے والا جو گی ہر گز دوسروں کو مقابلہ کی دعوت نہیں دیتا اور دوسرے الفاظ میں وہ چیلنج نہیں کرتا ہے، کیونکہ وہ جنوبی جانتا ہے اس کے شہر یاد و سرے شہروں میں اس کے جیسے افراد موجود ہیں جو ایسا کام انجام دے سکتے ہیں۔

لیکن اس کے بر عکس ان بیان کمکمل اطمینان کے ساتھ چیلنج کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ”اگر دنیا کے تمام لوگ بھی جمع ہو جائیں تو بھی ہمارے انجام دئے گئے کام کے مانند کام کو انجام نہیں دے سکتے ہیں۔“

سحر و جادو کے بارے میں بھی یہ فرق صادق ہوتا ہے۔ مذکورہ فرقوں سے سحر اور مجذہ کے حدود بھی کمکمل طور پر معلوم ہو جاتے ہیں۔ (غور کیجئے)

## غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ ”مجزہ“ کو مجرہ کیوں کہتے ہیں؟

۲۔ کیا ”مجزہ“ ”قانون علیٰت“ سے مستثنی ہے؟

۳۔ کن طریقوں سے ہم ”مجزہ“ کو جو گیوں اور جادو گروں کے کام سے الگ کر سکتے ہیں؟

۴۔ مجرہ کی اصلی شرائط کیا ہیں؟

۵۔ کیا آپ نے اپنی زندگی میں مجرہ جیسی کوئی چیز دیکھی ہے؟

## پانچوال سبق

پیغمبر اسلام ﷺ کا سب سے بڑا مجرہ

لافق مجرہ

تمام علمائے اسلام کا اس بات پر اعتماد ہے کہ قرآن مجید، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا مجرہ ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ یہ سب سے بڑا مجرہ ہے، یہ اس لئے ہے کہ:

۱۔ قرآن مجید ایک عقلی مجرہ ہے، جس کا لوگوں کی روح اور فکر سے سروکار ہے۔

۲۔ یہ ایک ابدی، لافقی اور ہمیشہ باقی رہنے والا مجرہ ہے۔

۳۔ یہ ایک ایسا مجرہ ہے جو گزشتہ چودہ صدیوں سے پاک پاک کر کہہ رہا ہے: ”اگر تم لوگ یہ کہتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئی ہے تو اس کے مانند کوئی اور کتاب پیش کرو۔“

قرآن مجید میں کئی جگہوں پر کھل کر چلتیج کی صورت میں اس قسم کے مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے:

ایک جگہ پر قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

(ق) لَئِنْ اجْتَمَعَتِ الْأَنْسَابُ جَنُونٌ عَلَى إِنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِشَهْدَةٍ وَلَوْكَانٌ بِعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (سورہ اسرار، ۸۸)

”آپ کہدیجئے کہ اگر انسان اور جنات سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں تو بھی نہیں لاسکتے، چاہے سب ایک دوسرے کے مددگار اور پشت پناہ ہی کیوں نہ ہو جائیں۔“

دوسری جگہ پر اس چلتیج کی شرط کو آسان تر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(امْ يَقُولُونَ افْتَرِيَّةٌ قَلْ فَإِنَّا تَوَاعَدْنَا مُشْتَهٰ مُفْتَرِيَّتَ وَادْعَوْمَنَ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ السَّلَامِ كُنْتُمْ صَدَقِينَ) (سورہ ہود، ۱۳)

”کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن بندے نے گڑھ لیا ہے تو کہدیجئے کہ اس کے جیسے دس سورے گڑھ کر تم بھی لے آؤ اور اللہ کے علاوہ جس کو چاہو اپنی مدد کے لئے بلا لوگ کرم اپنی بات میں سمجھی ہو۔“

اس کے بعد خاص طور پر مزید فرماتا ہے کہ اگر اس دعوت کو ان لوگوں نے قبول نہیں، تو جان لینا کہ یہ آیات خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔“ (سورہ ہود، ۱۴)

ایک بار اور مقابلہ کی شرائط کو کم سے کم کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رِيبٍ مَّا لَنَا عَلَى عَبْدٍ نَّافِقٍ تَوَابُورَةٌ مِّنْ مُشْتَهٰكُمْ مِّنْ دُونِ السَّلَامِ كُنْتُمْ صَدَقِينَ) (سورہ بقرہ، ۲۳)

”اگر تمھیں اس کتاب کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ۔ اور اللہ کے علاوہ جتنے تمھارے مدگار ہیں سب کو بلا لوا گر تم اپنے دعوت اور خیال میں سچی ہو۔“

اس کے بعد ولی آیت میں واضح طور سے فرماتا ہے:

(فَإِنْ لَمْ تَقْعُلُوا لِنَّ تَقْعِلَوْا إِنَّ الْنَّارَ أَتِيَ وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْجَنَّارُ قَاءُدَّتُ لِكُفَّارِينَ) (سورہ بقرہ ۲۳)

”اور اگر تم (کفار) ایسا نہ کر سکے اور یقیناً نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جسے کافرین کے لئے مہیا کیا گا ہے۔“

قرآن مجید کے مکرین کو پے در پے اس قسم کی دعوت دینا اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کے مجھہ ہونے پر زیادہ بھروسہ فرماتے تھے۔ اگرچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور بھی متعدد مجذبات نقل ہوئے ہیں، جو تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں۔

چونکہ قرآن مجید ایک زندہ مجھہ ہے اور ہم سب کی اس تک آسانی کے ساتھ رسانی ہے، اس لئے ہم مجذبات کی بحث میں زیادہ تر اسی پر تکیہ کرتے ہیں۔

اس چیلینج کے مقابلہ میں مخالفین کا مجھ

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ قرآن مجید نے مقابلہ کی دعوت کے سلسلہ میں مخالفین پر زیادہ سے زیادہ باؤڑا لایا ہے، اور مختلف بھاطر کانے والی عبارتوں سے ان کو دعوت دی ہے تاکہ کسی کے لئے کوئی بہانہ اور عذر باقی نہ رہے۔ جیسے:

”اگر سچ کہتے ہو،...، ”ہر گز نہیں کر سکتے“، ”تمام لوگوں سے مدد لے لو“... ”کم از کم اس جیسا ایک سورہ لے آؤ۔“ اور ”اگر کافر ہو گئے تو جلا دیئے والی آگ تمھارے انتظار میں ہے۔“ یہ تعبیریں اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔

یہ سب ایک طرف، دوسری طرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے مخالفین سے کوئی آسان مقابلہ نہیں تھا، کیونکہ اسلام نے صرف ان کے نہ ہب کو خطرہ میں ڈال دیا تھا، جس پر وہ سختی سے پابند تھے بلکہ ان کے اقصادی اور سیاسی منافع حتیٰ ان کے وجود کو بھی خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اسلام کی ترقی اور نفوذ نے ان کی پوری زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ لہذا وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کے لئے میدان میں آنے پر مجبور تھے۔

انھیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہتھا کرنے کے لئے ہر قیمت پر قرآن مجید کی جیسی چند آیتوں کو لانا چاہئے تھا تاکہ اس کے بعد قرآن ان کو چیلینج دے کر انھیں عاجز اور ناتوان نہ کر سکتا اور اپنی حقانیت کی سند پیش نہ کر سکتا۔

انہوں نے اپنے زمانہ کے فصاحت و بلاغت میں کمال رکھنے والے تمام عربوں سے مدد طلب کی، لیکن جب بھی قرآن مجید کے مقابلہ میں آئے، تو نکست سے دوچار ہوئے اور پچھے ہٹ گئے کہ اس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

ولید بن مغیرہ کا واقعہ

قرآن مجید سے مقابلہ کرنے کے لئے بلائے گئے لوگوں میں ”ولید بن مغیرہ“ بھی شامل تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ ”بنی مخزوم“ سے تھا۔ جو اس زمانہ میں عربوں کے درمیان حسن تدبیر اور فکر صائب کے لحاظ سے بڑی شہرت کا حامل تھا۔

کفار نے اس سے درخواست کی کہ اس سلسلہ میں غور و خوض کر کے قرآن مجید کی عجیب و غریب آیات اور ان کے غیر معمولی نفوذ کے بارے میں اپنا نظر یہ پیش کرے۔

”ولید نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ قرآن مجید کی چند آیات کی تلاوت فرمائیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ”سورہ حم سجدہ“ کی چند آیات کی تلاوت فرمائی۔

ان آیات نے ولید کے اندر ایسا اضطراب اور بیجان پیدا کیا کہ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ”قبلہ نبی مخزوم“ کی منعقد شدہ محفل میں جا پہنچا اور ان سے مخاطب ہو کر بولا:

خدا کی قسم میں نے محمد (ص) سے ایسا کلام سنایا ہے کہ نہ انسان کے کلام کے مانند ہے اور نہ جن اور پریوں کے کلام کے مانند... اس کے بعد ولید بن مغیرہ نے یوں کہا:

”وان لہ لخلافۃ وَأَن عَلیْهِ لطلاوة وَأَن أَعْلَاهُ لمشروأَن اسفله لمعدق وَان يعلمو ولا يعلی علیہ۔“

ان کے کلام میں ایک خاص مٹھاں اور زیبائی ہے، (ایک درخت کے مانند) اس کا اپری حصہ میوؤں سے بھرا ہوا اور اس کی جڑ مضبوط ہے۔ یہ ایک ایسا کلام ہے جو ہر چیز پر غالب ہے اور کوئی چیز اسے مغلوب نہیں کر سکتی ہے۔

ولید کے یہ کہنے سے قریش کے درمیان یہ آواز گونجئی گئی کہ ولید بن مغیرہ محمد ﷺ کا دلدار ہو گیا ہے!

”ابو جہل“ نے فوراً مغیرہ کے گھر جا کر قریش میں پھیلی ہوئی یہ بات اس کو بتائی اور اسے قریش کی مجلس میں آنے کی دعوت دی۔

ولید بن مغیرہ نے قریش کی مجلس میں آ کر کہا:

”کیا تم لوگ یہ سوچتے ہو کہ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دیوان ہو گیا ہے؟ کیا تم لوگوں نے کبھی اس میں دیوانگی کے آثار دیکھے ہیں؟!

حاضرین نے کہا: ”نبیں“

پھر ولید نے پوچھا:

کیا تم لوگ خیال کرتے ہو کہ وہ جھوٹ بولتا ہے؟ کیا اب تک وہ تم لوگوں میں ایک سچے اور امین شخص کی حیثیت سے مشہور نہیں تھے اور اسے تم صادق و امیں نہیں کہتے تھے؟!

قریش کے بعض سرداروں نے کہا: پھر ہم اس کی طرف کون سی نسبت دیں؟

ولید نے تھوڑی دیر غور و فکر کر کے کہا: تم لوگ کہو: وہ ساحر ہے۔

اگرچہ کفار اس تعبیر سے قرآن مجید کے چاہنے والوں کو اس سے جدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ تعبیر ”ساحر“ خود اس بات پر ایک زندہ دلیل تھی کہ قرآن مجید غیر معمولی طور پر جذب کرنے والی پرکشش کتاب ہے، لہذا انہوں نے اس جذب کرنے والی قوت کا نام سحر رکھا، جبکہ اس کا سحر سے کوئی ربط نہیں تھا۔

اس کے بعد کفار قریش نے ہر جگہ اس کا زبردست پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ماہر جادو گر ہے اور یہ آیات اس کے جادو ہیں، اس سے دوری اختیار کریں اور اس کا کلام سننے سے پر ہیز کریں!

لیکن تمام کوششوں کے باوجود ان کی یہ ریشہ دو ایال کامیاب نہ ہو سکیں اور ہر گوشہ و کنار میں موجود حقیقت کے پاک دل بیان سے جو ق در جو ق قرآن مجید کی طرف آتے رہے اور اس الہی پیغام کے آب زلال سے سیراب ہوتے رہے۔ اس طرح قرآن مجید کے دشمن شکست کھا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔

آج بھی قرآن مجید تمام دنیا والوں کو چھیلینج کرتے ہوئے مقابلہ کی دعوت دے رہا ہے اور پاکار پاکار کے کہہ رہا ہے : اے ہر قوم و ملت کے دانشورو، اے فلاسفہ، اے ادیبو اور اے اہل قلم ! اگر تم قرآن مجید کی آیات کے بارے میں شک و شبہ رکھتے ہو اور انھیں انسانی عقل و فکر کی اختراع سمجھتے ہو تو تم بھی اس کے مانند کلام لے آؤ !

ہم یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ اسلام کے دشمن بالخصوص عیسائی پادری (جو اسلام کو ایک انقلابی اور بامعنی دین کی حیثیت سے اپنے لئے سخت اور خطرناک رقیب جانتے ہیں) ہر سال اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنے پر کروڑوں ڈالر خرچ کرتے ہیں اور مختلف اسلامی ممالک میں گوناگون شفاقت، علمی، علاج و معالجہ اور صحت عامہ کے پروگراموں کی آڑ میں سرگرم عمل ہیں۔ ان کے لئے بہت آسان ہوتا گروہ عربی زبان کے عیسائی دانشوروں، شاعروں، اہل قلم اور فلاسفہ کو دعوت دیتے تاکہ وہ قرآن مجید کی سورتوں کے مانند چند سورتیں لکھ کر ان کی تشویش کر کے مسلمانوں کا منہ بند کر دیں !!

اگر ان کے لئے یہ ممکن ہوتا تو قطعاً وہ اس کام کو ہر قیمت پر انجام دینے سے گریز کرتے۔

اس موضوع کے مقابلہ میں ان کی ناقلوں قرآن مجید کے مخالفین کی بڑی شکست اور قرآن مجید کے لافانی مجرم ہونے پر واضح اور روشن دلیل ہے۔

### غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا مججزہ کیوں قرآن مجید شمار ہوتا ہے؟
- ۲۔ قرآن مجید کیسا چھیلینج کرتا ہے؟
- ۳۔ اسلام کے دشمنوں نے قرآن مجید کو کیوں سحر سے نسبت دی ہے؟
- ۴۔ اسلام، کیوں موجودہ عیسائیت کا سخت رقیب ہے؟
- ۵۔ ”ولید بن مغیرہ فخر زومی“ کا واقعہ کیا ہے؟

## چھٹا سبق

قرآن مجید کے اعجاز کی ایک جملہ

حروف مقطعات کیوں؟

قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کے آغاز میں "حروف مقطعات" جیسے: "اَلْمُرِ اَوْرِ" یہیں۔

بعض اسلامی روایتوں کے مطابق "حروف مقطعات" کا ایک فلسفہ اور راز یہ ہے کہ خداوند متعال یہ دکھانا چاہتا ہے کہ یہ عظیم اور لافانی مجذہ قرآن مجید کیسے ان سادہ حروف "الف، باء" سے وجود میں آیا ہے۔ کیسے یہ ایک عظیم کلام ایسے حروف اور الفاظ سے بنائے ہے، جن کو ہر چند سالہ بچہ بھی پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، حقیقت میں اتنے عظیم کام کا ایسے کلمات والفالفاظ سے وجود میں آنا ہی سب سے بڑا مجذہ ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کتنے پہلوؤں سے مجذہ ہے؟ کیا صرف فصاحت و بلاعث کے لحاظ سے اور دوسرے الفاظ میں: صرف عبارتوں کی مٹھاس، مطالب کے رسائیوں اور ان کے غیر معمولی نفوذ سے یادوسرے پہلوؤں سے بھی مجذہ ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جب ہم قرآن مجید پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالتے ہیں تو ہر زاویہ اور ہر دریچہ سے اس کے اعجاز کے چہروں میں میں سے ایک چہرہ نظر آتا ہے، جیسے:

۱۔ فصاحت و بلاعث: اس کے الفاظ اور مفہومیں غیر معمولی مٹھاس اور کشش اور عجیب و غریب قوت جاذبہ پائی جاتی ہے۔

۲۔ قرآن مجید ہر لحاظ سے بلند مطالب و مفہومیں پیش کرتا ہے، بالآخر ہر قسم کے خرافات سے پاک عقائد بیان کرتا ہے۔

۳۔ علمی مجذرات: یعنی ایسے مسائل کے رخ سے پرداہ اٹھنا جو اس زمانے تک انسان کے لئے پوشیدہ تھے۔

۴۔ مستقبل میں رونما ہونے والے بعض واقعات کے بارے میں واضح اور دقیق پیشین گوئی (قرآن مجید کی غیبی خبریں)۔

۵۔ قرآن مجید میں کسی بھی قسم کے اختلاف، تضاد اور تعارض کا نہ ہونا... ان کے علاوہ بھی اعجاز قرآن کے بہت سے پہلوؤں۔

ذکورہ پانچ مسائل کے بارے میں بحث بہت طولانی ہے۔ لیکن ہم چند اس باق کے ضمن میں اس بحث کے کچھ دلچسپ گوشوں کو تحقیق کے ساتھ بیان کریں گے:

فصاحت و بلاعث

ہم جانتے ہیں کہ ہر کلام کے دو پہلو ہوتے ہیں "الفاظ" اور "مفہوم"۔

اگر کلام، کے الفاظ اور کلمات، خوشنما، شاستہ، منظم، منجھم اور ہماهنگ ہوں اور پیچیدگی سے پاک ہوں اور اس کے جملوں کی ساخت معنی و مطلب کو کا مل طور پر دلچسپ اور جذاب صورت میں پیش کرے تو اس کلام کو فضیح و بلبغ کلام کہتے ہیں۔

قرآن مجید عالی ترین حد تک ان دو خصوصیات کا حامل ہے، اسی لئے آج تک کوئی شخص اس قسم کی آیات اور سورتیں نہیں لاسکا ہے جن میں ایسی کشش

، جذابیت، مٹھاں اور زیبائی پائی جاتی ہو۔

ہم گز شتنہ سبق میں پڑھ چکے ہیں کہ مشرکین عرب کا منتخب شخص، ”ولید بن مغیرہ“، قرآن مجید کی چند آیتوں کی تلاوت سن کر مضطرب اور پریشان ہو کر فکرو اندیشہ میں غرق ہو گیا، اس نے ایک مدت تک غور و فکر اور مطالعہ کے بعد قرآن مجید سے مقابلہ کرنے کے لئے قریش کے سرداروں کو حکم دیا کہ قرآن مجید کو ”جادو“ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جادو گر کہیں!

کفار نے پیغمبر اسلام ﷺ کو متعدد بار ساحر کی نسبت دی، اگرچہ وہ اس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کرنا چاہتے تھے لیکن وہ حقیقت میں آپکی تعریف و تمجید کر رہے تھے، کیونکہ یہ سحر کی نسبت قرآن مجید کے غیر معمولی نفوذ کا اعتراف تھا، چونکہ عام طور پر اس کی توجیہ نہیں کی جاسکتی تھی اس لئے انھیں اسے ایک مر موز اور نامعلوم جاذبہ کی حیثیت سے قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

لیکن کفار اس بات کے بجائے کہ حقیقت کو قبول کریں، قرآن مجید کو مجذہ شمار کریں اور ایمان لائیں، اس کے خلاف ایک بات گڑھ کر گمراہ ہو گئے اور اسے جادو قرار دیا!

تاریخ اسلام میں ایسے واقعات بہت پائے جاتے ہیں کہ ضدی، تندرخواор جھگڑا لو افراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جیسے ہی آتے تھے اور آنحضرت سے قرآن مجید کی آیات کی تلاوت سنتے تھے تو فوراً اپنا عقیدہ بدل دیتے تھے، کیونکہ قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں اسلام کا نور چکنے لگتا تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی کشش اور فصاحت و بلاعثت یقیناً ایک مجذہ ہے۔

ماضی ہی کی بات نہیں، موجودہ زمانے میں بھی عربی ادبیات کے ماہرین جس قدر قرآن مجید کو پڑھتے ہیں اور اس کی تکرار کرتے ہیں وہ اس سے نہ صرف نہیں تھکتے اور سیر نہیں ہوتے بلکہ زیادہ سے زیادہ لذت محسوس کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی عبارتیں انتہائی دقيق اور منظم ہیں۔ یہ تعبیرات بیان کی پاکیزگی اور سنجیدگی کے علاوہ واضح اور گویا ہیں۔ ضرورت کے وقت محکم اور منہ توڑ جواب دینے والی ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید کے نازل ہونے کے زمانے میں ادبیات کے لحاظ سے عربی زبان ترقی کے عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ اسی لئے عصر جاہلیت کے عربی اشعار آج بھی عربی ادبیات کے بہترین نمونے شمار ہوتے ہیں۔

مشہور ہے کہ ہر سال حجاز کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر ”بازار عکاظ“ نامی ایک تجارتی اور ادبی مرکز میں جمع ہو کر اپنے بہترین اشعار کے نمونے پیش کرتے تھے۔ ان میں سے سب سے بہتر شعر کو ”سال کے بہترین شعر“ کے عنوان سے انتخاب کیا جاتا تھا اور اسے لکھ کر خانہ کعبہ میں لکھا دیا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے زمانے میں ”معلقات سبع“ کے نام سے اس قسم کے سات نمونے خانہ کعبہ میں موجود تھے۔ لیکن قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد اس کی فصاحت و بلاعثت کے مقابلہ میں یہ اشعار اس قدر پھیلے پڑ گئے کہ نہ صرف انھیں بذریعہ وہاں سے ہٹا دیا گیا بلکہ انھیں فراموش بھی کر دیا گیا!

مفسرین قرآن نے اپنی صلاحیتوں کے مطابق قرآن مجید کی مختلف آیتوں کے عجیب و غریب باریکیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ ان تفاسیر کی طرف رجوع کر کے اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید سے آشنائی اور معرفت حاصل ہونے پر معلوم ہو گا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مندرجہ ذیل کلام میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہے:

”ظاهرہ اینیق و باطنہ عینیت لا تخصی عجائب ولا تبلی غرائب۔“

”قرآن مجید کا ظاہر خوش آئند اور زیبائے اور اس کا باطن گھر اور عینیت ہے۔ اس کے عجائب ناقابل شمار اور اس کے غرائب ناقابل زوال ہیں۔“

مکتب قرآن کے سب سے بڑے شاگرد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اس سلسلہ میں نجح البلاغہ میں فرماتے ہیں:

”فَيَرْبِعُ الْقَلْبُ وَيَنْأِيْعُ الْعِلْمُ وَالْمَلْقُبُ جَلَاءُغَيْرَهُ“

”قرآن مجید دلوں کے لئے بہار ہے، اس سے علم و دانش کے چشمے البتے ہیں اور انسان کے قلب و روح کو جلا بخشنے والا صیقل اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔“

غور کیجئے و جواب دیجئے

۱۔ قرآن مجید کے ”حروف مقطعات“ کا فلسفہ کیا ہے؟

۲۔ کیا قرآن مجید صرف ایک اعتبار سے مجرہ ہے یا کئی اعتبار سے مجرہ ہے؟

۳۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منا لفین کیوں ساحر کہتے تھے؟

۴۔ فصاحت و بلاغت کے درمیان کیا فرق ہے؟

۵۔ ”معالمات سبع“ کس زمانے سے مربوط ہے اور اس کا مطلب کیا ہے؟

## ساتواں سبق

خداشناکی کے بارے میں قرآن مجید کا

سب سے پہلے ہمیں اس معاشرے اور ماحول کا فکری اور ثقافتی اعتبار سے تجزیہ کرنا چاہئے، جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ، اس زمانے میں سر زمین میں حجاز دنیا کا پسمندہ ترین خطہ تھا اور عصر جاہلیت کے لوگوں کو وحشی یا نیم وحشی اقوام کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

عقیدہ کے لحاظ سے وہ لوگ بت پرستی میں غرق تھے۔ ان کی تہذیب و تمدن پر مختلف شکلوں میں پتھر اور لکڑی کے بنائے ہوئے بتوں کا منحوس سایہ و سمع پیاس نے پر چھایا ہوا تھا، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ جھور کے بت بنا کر ان کے سامنے وزان بیٹھ کر پوچھ کرتے تھے، لیکن قحط سالی کے وقت انھیں کھا جاتے تھے!

بیٹیوں سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ انھیں انتہائی بے دردی سے زندہ درگور کر دیتے تھے، اس کے باوجود فرشتوں کو خدا کی یہیں کہتے تھے! اور خداوند متعال کی ذات کو انسان کی حد تک گرا دیتے تھے۔

توحید اور یکتاپرستی پر سخت تجуб کرتے تھے، جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں یکتاپرستی کی دعوت دی تو انہوں نے نہایت تجوب اور حیرانی کی حالت میں کہا:

(أَجْعَلِ الْأَهْمَارَ لَهَا أَحَدًا إِنَّ هَذَا لِشَيْءٍ عَجَابٌ) (سورہ ۵)

”کیا اس نے سارے خداوں کو جوڑ کر ایک خدا بنا دیا ہے یہ تو انتہائی تجوب خیز بات ہے۔“

جو بھی شخص ان کی خرافات، ان کے جھوٹے افسانوں اور نظریات کے خلاف زبان کھولتا تھا، وہا سے دیوانہ کہتے تھے۔

ان کے معاشرے پر قبائلی نظام انتہائی شدت سے حکم فرماتھا اور مختلف قبیلوں کے درمیان اختلافات کا یہ عالم تھا کہ ان کے درمیان جنگ کے شعلے کبھی خاموش نہیں ہوتے تھے، بار بار روئے زمین پر ایک دوسرے کے خون کی ہولی کھیلتے تھے، قتل و غارت گری ان کا روزمرہ کا معمول بن گیا تھا اور اس پر فخر و مبارکات کرتے تھے۔

ان کے اہم ترین مرکزی شہر، کہ میں چند گنے چنے ہی پڑھے لکھے افراد تھے اور عالم و دانشور تو شاذ و نادر ہی پائے جاتے تھے۔

اسی ماحول اور معاشرے میں ایک ایسا شخص اٹھا، جس نے نہ کسی مدرسہ کا رخ کیا تھا اور نہ کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تھے کیا تھا وہ ایک ایسی کتاب لے آیا جو مفہوم و معنی کے لحاظ سے اس قدر عظیم ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی صاحبان علم و دانش اس کی تفسیر میں مشغول ہیں اور ہر دور میں نئے حقائق کا اکشاف کرتے ہیں۔

قرآن مجید کا نبات اور اس کے نظام کے بارے میں نہایت دقیق حساب شدہ تصویر پیش کرتا ہے۔ توحید کو اس کی مکمل صورت میں بیان کرتا ہے۔ زمین و آسمان کی پیدائش اور شب و روز، چاند، سورج، جہادات و نباتات اور انسان کی تحقیق کے اسرار کو خداۓ وحدہ لاشریک کی نشانیوں کی دلیل کے طور پر اپنی مختلف آیات میں مختلف انداز، تعبیرات اور تشبیہات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

کبھی وہ انسان کے وجود کی گہرائیوں میں اتر کر فطری توحید کی بات کرتا ہے:

(فَإِذَا رَكِنْتُ إِلَى اللَّهِ فَلَمْ يُنْجِحْهُمْ إِلَيَّ الْأَبْرَادُ هُمْ يُشَرِّكُونَ) (سورة عنكبوت، ٢٥)

”پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو ایمان و عقیدہ کے پورے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں، پھر جب وہ نجات دے کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو فوراً اُتر ک اختیار کر لیتے ہیں۔“

کبھی عقل و شعور کے ذریعہ استدلال کرتے ہوئے توحید کو ثابت کرتا ہے اور اس و سبق کا نات اور اپنے نفس کے بارے میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ زمین و آسمان، حیوانات، پہاڑوں، سمندروں، بارش کے بر سے، باد نیم کے جھوٹکوں اور انسان کے جسم و روح کے انتہائی دقیق، منظم اور پیچیدہ تخلیقی اسرار و رموز سے پرداھاتا ہے۔

خداوند متعال کی صفات کو بیان کرنے کے لئے انتہائی گہرے اور دلکش طریقے کا انتخاب کرتا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے :

(لیس کمشد شیء) (سورة شوری، ۱۱)

”کوئی بھی چیز اس کے مانند نہیں ہے“

دوسری جگہ پر فرماتا ہے :

”هُوَ الَّذِي لَمْ يَرِدْ إِلَيْهِ إِلَّا هُوَ عَالَمُ الْغَيْبِ وَلَا شَهَادَةً حَوَالَ حَمْنَ الرَّجِيمِ هُوَ السَّمَاءُ الْأَنْعَمُ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقَدُّوسُ إِلَّمَ الْمُؤْمِنِينَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ إِلَّا هُوَ الْمَكِبِرُ سَجَنُ الْمَدَّعِيِّ عَلِيَّشَرِّ كَوْنُ هَوَ السَّمَاءُ الْأَنْعَمُ الْبَارِيُّ الْمَصْوُرُ لِهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى يَسْتَحِي لِمَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“

(سورہ حشر، ۲۲)

”وہ خدا وہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے اور وہ حاضر و غائب سب کا جانے والا، عظیم اور داگی رحمتوں کا مالک ہے۔ وہ اللہ وہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ بادشاہ، پاکیزہ صفات، بے عیب، امان دینے والا، نگرانی کرنے والا، صاحب عزت، زبردست اور کبریائی کا مالک ہے۔ اللہ ان تمام باتوں سے پاک و پاکیزہ ہے جو مشرکین کیا کرتے ہیں۔ وہ ایسا خدا ہے جو پیدا کرنے والا، ایجاد کرنے والا اور صورتیں بنانے والا ہے۔ اس کے لئے بہترین نام ہیں، زمین و آسمان کا ہر ذرہ اسی کے لئے محو تسبیح ہے اور وہ صاحب عزت و حکمت ہے۔“

خداوند متعال کے علم کی توصیف اور اس علم کے لامح و دھونے کے بارے میں حسین ترین تعبیر کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے :

(وَلَوْ أَنْمَانِ الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَلَبْرٌ يَمْدُدُ مِنْ بَعْدِ سَبْعَةٍ أَكْبَرٌ مَافَنِدَتْ كَلْمَةُ اللَّهِ...) (سورة لقمان، ۲۷)

”اور اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور (سیاہی کے طور پر) سمندر کا سہارا دینے کے لئے سات سمندر اور آجائیں تو بھی کلمات الہی تمام ہو نے والے نہیں ہیں“...

خداوند متعال کے تمام چیزوں پر حاوی ہونے اور اس کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کے سلسلہ میں قرآن مجید ایسی اعلیٰ تعبیرات پیش کرتا ہے کہ وہ تعبیرات صرف قرآن مجید سے ہی مخصوص ہیں :

(وَسَمَا الْمَشْرَقُ وَالْمَغْرِبُ فَلِيَنْتَوْلَا فَقْشُ وَجْهُ اللَّهِ...) (سورہ بقرہ، ۱۱۵)

”اور اللہ کے لئے مشرق بھی ہے اور مغرب بھی، امذتم جس جگہ کی طرف رخ کر لو گے سمجھو ہیں خدا موجود ہے“...

... وَهُوَ مَعْلُومٌ أَيْنَ مَا كَنْتُمْ وَاللَّهُمَا تَعْلَمُونَ بَصِيرٌ) (سورہ حدیث، ۳)

”اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی رہو اور وہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔“

جب معاد اور قیامت کی بات کرتا ہے تو مشرکین کے تعجب اور انکار کے مقابلہ میں کہتا ہے:

(...) ”انسان اپنی خلقت کو بھول کر کہتا ہے) ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟“

”آپ کہدیجئے کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا اور وہ ہر مخلوق کا بہتر جانے والا ہے۔

”اس نے تمہارے لئے ہرے درخت سے آگ پیدا کر دی ہے تو تم اس سے ساری آگ روشن کرتے رہو۔ (وہ خدا جس نے آگ کے شعلوں کے ساتھ پانی کو بھی وجود بخشا ہے وہی مرنے کے بعد پھر زندہ کر سکتا ہے) کیا جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کا مثل دوبارہ پیدا کر دے؟ یقیناً ہے اور وہ بہترین پیدا کرنے والا اور جانے والا ہے اس کا امر صرف یہ ہے کہ کسی شے کے بارے میں یہ کہنے کا رادہ کر لے کہ ہو جا، تو وہ شے ہو جاتی ہے۔“ (سورہ یس، ۸۲-۷۸)

جب فوٹو گرافی اور ٹیب ریکارڈ کا تصور بھی نہیں تھا، قرآن مجید نے انسان کے اعمال کے بارے میں اس وقت فرمایا ہے:

(یو مِنْذٰ تَحْدِثُ اخْبَارَهَا. بَأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَى لَهَا)

(سورہ زلزلہ، ۵-۴)

”اس (قیامت کے) دن وہ (زمین) اپنی خبریں بیان کرے گی کہ تمہارے پروردگار نے اسے اشارہ کیا ہے۔“

اور کبھی قرآن مجید ہاتھ، پاؤں اور بدن کی جلد کی گواہی کے بارے میں ذکر کرتا ہے:

(الْيَوْمَ نَخْتَمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتَكْلِمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشَهِّدُ أَرْجُلُهُمْ) (سورہ یس، ۲۵)

”آج ہم ان کے منہ پر مہر لگادیتے ہیں اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے۔“

(وَقَالَ الْجَلُودُ هُمْ شَهِدُوْمْ تَعْلِيْنَا قَالَوْاْ أَنْطَقَنَا اللَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ) (سورہ فصلت، ۲۱)

”اور وہ اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیسے شہادت دیدی؟ تو وہ جواب دیں گے ہمیں اسی خدائے گویا بنا یا ہے جس نے سب کو

گویاً عطا کی ہے۔“

قرآن مجید کے معارف کی قدر و قیمت، اس کے مضامین و مفہوم کی عظمت اور ان کے معارف کا خرافات سے پاک و منزہ ہونا اس وقت واضح ہوتا ہے جب ہم اس کا مقايسہ موجودہ تحریف شدہ توریت و انجیل سے کرتے ہیں، مثلاً ہم دیکھیں کہ آدم کی تخلیق کے بارے میں توریت کیا کہتی ہے اور قرآن مجید کیا کہتا ہے؟

انبیاء علیہم السلام کی داستانوں کو توریت کس انداز میں پیش کرتی ہے اور قرآن مجید کا انداز بیان کیا ہے؟

توریت اور انجیل خداوند متعال کی کیسے توصیف کرتی ہیں اور قرآن مجید کس طرح خدا کی توصیف کرتا ہے؟

اس صورت میں قرآن مجید اور توریت و انجیل کے درمیان فرق واضح طور پر معلوم ہو جائے گا۔

(اس سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لئے ”رہبران بزرگ“ نامی فارسی کتاب کا مطالعہ کریں)

## غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ جس معاشرہ میں قرآن مجید نازل ہوا ہے، اس کے ماحول کی خصوصیات بیان کیجئے۔
- ۲۔ اس معاشرے میں زندگی بسر کرنے والوں کے افکار پر بت پرسنی نے کیا اثرات ڈالے تھے؟
- ۳۔ فطری اور استدلالی توحید کے درمیان کیا فرق ہے؟
- ۴۔ پروردگار عالم کی معرفت اور اس کی صفات کے بارے میں قرآن مجید کے بیان کی روشن کیسی ہے؟ مثالوں کے ساتھ واضح کیجئے۔
- ۵۔ قرآن مجید کے مطالب و مفہوم کو بہترین صورت میں کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟

# آٹھواں سبق

قرآن مجید اور جدید سائنسی اکشافات

بیشک قرآن مجید علوم طبیعتیات یا علم طب، علم نفسیات اور علم ریاضی کی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید ہدایت اور انسان سازی کی کتاب ہے اور جو کچھ اس سلسلہ میں ضروری ہے وہ اس میں پایا جاتا ہے۔ ہمیں قرآن مجید سے موقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ ہمارے لئے مختلف علوم کا دائرہ المعارف ہو۔ بلکہ ہمیں قرآن مجید سے نور ایمان و ہدایت، تقویٰ و پرہیز گاری، انسانیت و اخلاق اور نظم و ضبط کے قوانین کا مطالبہ کرنا چاہئے اور قرآن مجید میں یہ سب چیزیں موجود ہیں۔

لیکن قرآن مجید مذکورہ مقاصد تک پہنچنے کے لئے کبھی علوم طبیعتیات کے بعض مسائل اور خلقت کے اسرار اور کائنات کے عجائب کی طرف بھی کچھ اشارے کرتا ہے۔ باخصوص توحید کی بحث میں ”برہان نظم“ کے تابع خلقت کائنات کے بعض اسرار سے پروانہ کرائیے مسائل کو واضح کرتا ہے کہ اس ماحول اور زمانہ کے دانشوروں کے لئے بھی نامعلوم تھے۔

قرآن مجید کے اس قسم کے بیانات کے مجموعہ کو ہم ”قرآن مجید کے علمی مجذبات“ کہتے ہیں۔ یہاں پر اس قسم کے چند مجذبات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

قرآن مجید اور قوت جاذبہ کا قانون

مشہور سائنسدان ”نیوٹن“ سے پہلے کسی نے قوت جاذبہ کے کلی قانون کا مکمل طور پر اکشاف نہیں کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن ”نیوٹن“ سب کے ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سیب درخت سے جدا ہو کر زمین پر گر گیا۔ اس چھوٹے اور معمولی واقعہ نے نیوٹن کے ذہن کو اس قدر سوچ میں متلا کر دیا کہ وہ برسوں تک اس سلسلہ میں غور و فکر کرتا رہا کہ یہ کون سی طاقت ہے جس نے سب کو اپنی طرف کھینچ لیا؟ کیوں یہ سب آسمان کی طرف نہیں گیا؟ بالآخر برسوں کی فکر کے بعد اس نے قانون جاذبہ کا اکشاف کیا کہ ”دو جسم اپنے جسموں کی برادرست نسبت سے اور ان کے درمیان فاصلہ کی محدود ممکوس نسبت سے ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔“

اس قانون کے اکشاف سے معلوم ہوا کہ نظام شمسی کہاں پر واقع ہے؟ یہ بڑے بڑے سیارے کیوں اپنے مدار میں سورج کے گرد گھومتے ہیں؟ کیوں یہ فرار کر کے مختلف اطراف کی طرف نہیں چلے جاتے؟ وہ ایک دوسرے پر کیوں نہیں گرتے؟ یہ کوئی طاقت ہے جس نے ان سیاروں کو اس لامتناہی فضا میں ایک خاص اور دلیق مدار میں گردش کی حالت میں رکھا ہے اور وہ ذرہ برابر بھی اس سے انحراف نہیں کرتے ہیں؟!

جی ہاں! ”نیوٹن“ نے اکشاف کیا: ایک جسم کا دائرہ کی صورت میں گھومنا اس کے مرکز سے دور ہونے کا سبب بنتا ہے اور قانون جاذبہ اسے مرکز کی طرف کھینچتا ہے۔ اگر یہ دو قوتیں (دافعہ و جاذبہ) مکمل طور پر تعادل رکھتی ہوں، یعنی ”اجسام“ اور ان کے درمیان ”فاصلے“ اتنی قوت ”جاذبہ“ پیدا کریں کہ قوت ”دافعہ“ کی دورانی حرکت کی سرعت اور مرکز سے دور ہونے کا سبب بنیں تو ”جاذبہ“ و ”دافعہ“ کا یہ تعادل انھیں دامنی طور پر اپنے مدار میں

رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

لیکن قرآن مجید نے چودہ سو سال پہلے اس حقیقت کو سورہ رعد کی دوسری آیت میں یوں بیان کیا ہے:

(الْمَلَكُ لِنَزَّلَ الْمُنْزَلَ عَلَى الْعَرْشِ وَسَجَّلَ لِلشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلَّ يَمْرِي لِاجْلِ مُسْمَيِّ يَدِ بِرِ الْأَمْرِ يُفَصِّلُ الْآيَتِ لِعَلْمِ الْبَلَاقَاءِ رَبِّكُمْ تَوْقُونَ) (الله ہی وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر کسی ستون کے بلند کر دیا ہے، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، اس کے بعد اس نے عرش پر اقتدار قائم کیا اور آفتاب و ماہتاب کو منخر بنایا کہ سب ایک معینہ مدت تک چلتے رہیں گے، وہی تمام امور کی تدبیر کرنے والا ہے اور اپنی آیات کو منفصل طور سے بیان کرتا ہے کہ شاید تم لوگ پروردگار کی ملاقات کا یقین پیدا کرلو۔“

اسی آیت کے ذیل میں حضرت امام علی بن موسی الرضا علیہ السلام سے نقل کی گئی ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

اللَّيْسَ السَّالِقُولُ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرُوْخًا؟

قلت: بلى، قال: ثُمَّ عَمَدٌ لَكُنْ لَا تَرُوْخًا !

(امام نے فرمایا: کیا خدا نہیں فرماتا ہے کہ ہم نے نظر نہ آنے والے ستونوں (کے ذریعہ اسے بلند کیا)? راوی کہتا ہے میں نے امام کے سوال کے جواب میں عرض کی: جی ہاں۔ امام نے فرمایا: لہذا ستون موجود ہیں، لیکن تم انھیں نہیں دیکھ پاتے ہو۔“

کیا ”قوت جاذبہ“ کے مفہوم سے عام لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے عربی زبان میں ”عَمَدٌ لَا تَرُوْخًا“ (غیر مرئی ستون) سے زیادہ واضح اور آسان تعبیر موجود ہے؟!

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”هذَا النَّجُومُ الَّتِي فِي السَّمَاوَاتِ مَذَانِ الْمَدَائِنِ الَّتِي فِي الْأَرْضِ مَرْبُوطَةٌ كُلُّ مَدِينَةٍ إِلَى عَوْدِ مَنْ نُورٍ“

”آسمان پر موجود ہیہ ستارے، زمین پر موجود شہروں کے مانند شہر ہیں۔ ہر شہر دوسرے شہر کے ساتھ (ہر ستارہ دوسرے ستارے کے ساتھ) انور کے ستون کے ذریعہ جڑا ہوا ہے!“

آج کے سائنسدان اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ آسمان پر موجود ستاروں میں کروڑوں کی تعداد میں ایسے ستارے ہیں جن میں زندہ اور عقل و شعور رکھنے والی مخلوقات ساکن ہیں اگرچہ ان کی تفصیلات اور جزئیات ابھی تک انسان کی دسترس میں نہیں ہیں۔

زمین کے اپنے اور سورج کے گرد گھونمنے کا انشاف

مشہور ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے اس بات کا انشاف کیا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے، وہ تقریباً چار سو سال پہلے اٹلی میں رہنے والا، ”گلیلیو“ نام کا ایک ماہر فلکیات تھا۔ سو سال اس انشاف سے پہلے دنیا کے دانشور اور ماہر فلکیات، ایک مصری دانشمند ”بلیموس“ کے نظریہ ہیئت پر عمل پیرا تھے کہ وہ کہتا تھا: زمین کائنات کا مرکز ہے اور تمام دوسرے سیارے (کرّات) اس کے گرد گھومتے ہیں۔“

البتہ ”گلیلیو“ کو اس علمی اکشافات کے جرم میں کلیسا کے حامیوں کی طرف سے حکم کفر دیا گیا۔ اس نے اپنے اس نظریہ کے بارے میں بظاہر توبہ اور انطباع ندامت کر کے موت سے نجات پائی۔ لیکن آخر کار اس کے بعد والے دانشوروں اور سائنسدانوں نے اس کے نظریہ پر تحقیق جاری رکھی اور آج یہ مسئلہ نہ صرف ایک مسلم علمی حقیقت کے عنوان سے قبول کیا جا چکا ہے، بلکہ قبل حصہ تجربوں سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے۔ فضائی

پروازوں کے بعد یہ مسئلہ عین مشاہدات کے مرحلہ سے بھی گزر چکا ہے۔

مختصر یہ کہ زمین کی مرکزیت کا مسئلہ غلط ثابت ہوا اور معلوم ہو گیا کہ یہ ہماری آنکھوں کا دھوکہ ہے کہ ہم زمین کو ساکن اور تمام ستاروں اور سیاروں کو زمین کے گرد گھومتے محسوس کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہم خود حرکت میں ہیں اور ستاروں اور سیاروں کو حرکت میں فرض کرتے ہیں۔

بہر حال ”بٹلیوس“ کا نظریہ تقریباً پندرہ سو سال تک علماء اور دانشوروں کے ذہنوں پر چھایا رہا، حتیٰ قرآن مجید کے ظہور کے وقت بھی کوئی اس نظریہ کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

لیکن جب ہم قرآن مجید کی آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سورہ نمل کی آیت نمبر ۸۸ میں زمین کی گردش پر واضح صورت میں روشنی ڈالی گئی ہے:

(وَتَرِى إِلْجَابَ تَحْسِبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَرْمِّرُ مَرِّ الْحَابِ صُنْعَ السَّالِذِي أَنْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ) (سورہ نمل، ۸۸)

”اور تم پہاروں کو دیکھو گے تو سمجھو گے کہ جیسے وہ اپنی جگہ پر جامد ہیں حالانکہ یہ بادلوں کی طرح پل رہے ہوں گے۔ یہ اس خدا کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو محکم بنایا ہے اور وہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔“

ذکر کوہ آیت واضح الفاظ میں پہاڑوں کی حرکت کا ذکر کرتی ہے جبکہ ہم سب انھیں ساکن تصور کرتے ہیں۔ اور ان کی حرکت کی بادلوں کی حرکت سے تشبیہ دینا اس کی سرعت، نرمی اور سکوت اور بغیر شور و غل کے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ”زمین کی حرکت“ کو پہاڑوں کی حرکت سے تعبیر کر کے اس حقیقت کی عظمت کو آشکار کیا جا رہا ہے، کیونکہ یہ مسلم ہے کہ پہاڑ اپنے اطراف کی زمینوں کی حرکت کے بغیر کوئی حرکت نہیں رکھتے بلکہ دراصل ان کی حرکت زمین کی حرکت ہے (اپنے گرد گھومنا یا سورج کے گرد گھومنا یادوں نوں حرکتیں)۔

ذراغور کیجئے: ایک ایسے زمانے میں جب دنیا کی تمام علمی مخالف اور دانشور زمین کے ساکن و ثابت ہونے اور سورج اور تمام سیاروں اور ستاروں کے حرکت میں ہونے کے نظریہ کو باضابط طور پر قبول کرچکے تھے، یہ اعلان کرنا کہ زمین حرکت میں ہے، کیا یہ ایک عظیم علمی مجزہ شمار نہیں کیا جائے گا؟! اور یہ اعلان بھی ایک ایسے شخص کے توسط سے کہ جس نے نہ صرف کسی سے کوئی سبق نہیں پڑھا تھا بلکہ ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزار رہا تھا جو علم و تہذیب سے دور شمار ہوتا تھا، کیا یہ انسانی کتاب کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے؟

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ قرآن مجید کے علمی معجزات سے کیا مراد ہے؟

۲۔ ”قانون جاذب“ کا سب سے پہلے کس نے اکشاف کیا ہے اور وہ کس زمانہ میں زندگی بسر کرتا تھا؟

۳۔ قرآن مجید کس آیت میں اور کس تعبیر سے ”قانون جاذب“ کو بیان کرتا ہے؟

۴۔ ”زمین کے سکون کا نظریہ“ کس نے پیش کیا ہے اور یہ نظریہ کتنے سال تک دنیا والوں کے افکار پر چھایا رہا؟

۵۔ قرآن مجید نے کس آیت میں اور کس تعبیر سے ”زمین کی حرکت“ کو بیان کیا ہے؟

## نوال سبق

پیغمبر اسلام (ص) کی حقانیت پر ایک اور دلیل

نبوت کا دعویٰ کرنے والے کسی شخص کی دعوت کی حقانیت معلوم کرنے یا اس کے جھوٹ کا سرانگ لگانے کے لئے مجزہ کے مطالبہ کے علاوہ دوسرا ایک طریقہ بھی ہے اور یہ طریقہ مقصد تک پہنچنے کی ایک اور زندہ دلیل ہو سکتا ہے۔ اور وہ طریقہ درج ذیل قرائیں کی تحقیق و جمع آوری سے حاصل ہو سکتا ہے:

۱۔ اخلاقی خصوصیات اور اجتماعی ریکارڈ۔

۲۔ دعوت کے ماحول پر چھائے ہوئے حالات۔

۳۔ زمانہ کے حالات۔

۴۔ دعوت کے مطالب۔

۵۔ نفاذ و اجراء کے اصول و ضوابط اور مقصد تک پہنچنے کے وسائل۔

۶۔ معاشرے پر دعوت کے اثرات کا اندازہ۔

۷۔ مقصد کے بارے میں داعی کے ایمان و فدائکاری کا اندازہ۔

۸۔ انحرافی تجویزوں اور مشوروں کی موافقتنہ کرنا۔

۹۔ عمومی افکار پر تیزی سے اثر انداز ہونا۔

۱۰۔ ایمان لانے والے لوگوں کے بارے میں تحقیق کرنا کہ وہ کس قسم کے طبقات سے تعلق رکھتے ہیں؟!

تحقیقت میں اگر ہم ہر مدعا کے بارے میں مذکورہ دس مسائل پر سمجھدی گی سے غور و فکر اور بحث و تحقیق کریں تو ہم اس کے سچ اور جھوٹ کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان شدہ مطالب کے پیش نظر ہم مذکورہ دس مسائل کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے ایک مختصر تحقیق و تجزیہ پیش کریں گے اگرچہ ان کے بارے میں متعدد کتابیں تالیف کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ دوست اور دشمن کی لکھی گئی تاریخوں سے جو کچھ ہمیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجتماعی سرگرمیوں کے دوران آپؐ کی اخلاقی خصوصیات کے بارے میں معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ آپؐ اس قدر پاک و پاکیزہ اور ایماندار تھے کہ حتی جاہلیت کے زمانے میں بھی آپؐ کو ”امین“ کا لقب دیا گیا تھا۔ تاریخ کہتی ہے: مدینہ کی طرف بھرت کرتے وقت آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو مأمور فرمایا تھا کہ آپؐ کے مدینہ روانہ ہونے کے بعد لوگوں کی امانتوں کو ان تک پہنچادیں۔

آپؐ کی شجاعت، استقامت، حسن اخلاق، وسعت قلبی، جوانمردی اور عفو و بخشش جیسی خصوصیات کا مشاہدہ جنگ و صلح کی حالت میں کیا جاسکتا ہے با الخصوص فتح مکہ کے موقع پر آپؐ کی طرف سے شکست خورده خونخوار دشمنوں کے حق میں عام معافی کا اعلان ان خصوصیات کی ایک زندہ مثال ہے۔

۲۔ سب جانتے ہیں کہ عام لوگ، حتی غیر معمولی ذہانت کے مالک لوگ بھی، خواہ خواہ ما حول کے حالات سے متاثر ہوتے ہیں، البتہ بعض لوگ زیادہ اور بعض کم تر۔

ابذر اغور کیجئے کہ جس شخص نے اپنی زندگی کے چالیس سال جہل و بیت پرستی کے ماحول میں گزارے ہوں، ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزاری ہو کہ جس کے لوگوں کی تہذیب و تمدن کے تانے بانے شرک و خرافات کی بنیاد پر مختتم ہوئے ہوں، اس کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ فقط توحید کا دام بھرتے ہوئے شرک کے تمام مظاہر سے مقابلہ کرے؟!

یہ کیسے ممکن ہے کہ جہالت کے ماحول سے علم کے اعلیٰ ترین جلوے نمودار ہو جائیں؟!

کیا یہ قابلٰ یقین ہے کہ ایک ”مادرائے طبیعت“ نتائی اللہ کے بغیر ایسا عجیب مظہر وجود میں آئے؟!

۳۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور کس زمانے میں ہوا ہے؟ ایک ایسے زمانے میں کہ دنیا قرون و سطیٰ کے دور سے گزر رہی تھی، وہ مطلق العنانیت، استبداد، امتیازی سلوک اور قومی و طبقاتی ظلم کا دور تھا۔ بہتر ہے ہم اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کی زبان سے سنیں، جو ظہور اسلام سے پہلے اور بعد والے دور کے عین شاخص تھے، آپؐ فرماتے ہیں:

”خداؤند متعال نے آپؐ کو ایک ایسے زمانے میں رسالت پر مبuous فرمایا، جب دنیا کے لوگ حیرت کی وادی میں گمراہ و در بر تھے، ان کی عقلمنیں جان

لیواہواد ہوس کی تابع تھیں۔ غرور و تکبیر نے انھیں زوال سے دوچار کر دیا تھا۔ جاہلیت کی تالیکیوں نے انھیں گمراہ کر دیا تھا اور وہ جہل و اضطراب کی حالت میں سر گردال و پریشان تھے۔” (نفح الملانہ، خطبہ نمبر ۹)

اب ذرا غور کیجئے کہ جس دن کالا نجح عمل انسانوں کی مساوات، قومی اور طبقاتی تعصبات کو ختم کرنا اور ”امم المومنون اخوة“ (مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں) ہو، وہ دین اس زمانے کے حالات سے کیا مطابقت رکھتا ہے؟

۴۔ آپ کی دعوت کا موضوع، تمام جہات میں توحید، تمام ظالمانہ امتیازات کو ختم کرنا، عالم انسانیت کا اتحاد، ظلم و ستم سے مقابلہ کرنا، ایک عالم گیر (عادلانہ) حکومت کا منصوبہ، مستضعین کا دفاع اور انسانی اقدار کے اہم ترین معیار کے طور پر تقویٰ، پر ہیزگاری، پائیزگی اور امانت داری کا پر چار تھا۔

۵۔ آپ نے اپنے منصوبوں کو عملی جامد پہنانے میں کسی صورت میں بھی اس نامعقول نظریہ پر عمل نہیں کیا کہ ”مقصد و سیلہ کی توجیہ کرتا ہے“۔ کہ آپ اپنے مقدس مقاصد تک پہنچنے کے لئے مقدس وسائل سے استفادہ کرتے تھے۔

آپ دو ٹوک افاظ میں فرماتے تھے:

... ولا يجرِّ مُنكَمْ شَنَانَ قَوْمًا عَلَى الْأَعْدَلَوَا (۷)

(سورہ مائدہ، ۸)

... اور خبردار کسی قوم کی عداوت تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ انصاف ترک کر دو۔“ ...

میدان جنگ میں اخلاقی اصولوں کی رعایت کرنے، غیر فوجیوں (عام انسانوں) کو اذیت و تکلیف نہ دینے، درختوں اور نخلستانوں کو نابود نہ کرنے، دشمن کے لئے پینے کے پانی کو آلو دہ نہ کرنے، جتنی قیدیوں سے محبت سے پیش آنے اور اس قسم کے دسیوں مسائل کے بارے میں آپ کے احکام اس حقیقت کے واضح ثبوت ہیں۔

۶۔ اس معاشرے میں آپ کی دعوت کے اثرات کا یہ عالم تھا کہ اسلام کے دشمن، لوگوں کے آپ کے قریب آنے سے گھبراتے تھے، کیونکہ وہ آپ میں غیر معمولی قوت جاذب اور آپ کے کلام میں نفوذ کا اثر دیکھتے تھے۔ بعض اوقات آپ کی جگنوں کے دوران شوروں غل برپا کرتے تھے تاکہ لوگ آپ کے کلام کو سن کر آپ کے گرویدہ نہ ہو جائیں، اسی لئے آپ کے مجzen ماژروں سوچ پر پر دہلانے کے لئے آپ کو ”ساحر“ اور آپ کے کلام کو ”سحر“ سے تعبیر کرتے تھے کہ یہ بذات خود آپ کی دعوت کے غیر معمولی اور عجیب اثر کا اعتراض تھا۔

۷۔ اپنی دعوت کی راہ میں آپ کی جان ثاری کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہنچنے لائے ہوئے دین کے بارے میں دوسروں سے زیادہ مومن و پابند تھے۔

بعض جگنوں کے میدانوں میں، جہاں تازہ اسلام لائے ہوئے افراد بھاگ گئے لیکن آپ اپنہ تھی سے دشمن کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ اور جہاں پر دشمن لائچ اور دھمکی، مختصر یہ کہ ہر راہ سے سامنے آتا تھا آپ ان تمام مسائل کی پرواکنے بغیر اپنے عقیدہ پر سختی سے ثابت قدم رہتے تھے اور کمزوری اور شک و شبہ سے دوچار ہو کر ہر گز آپ کے قدم نہیں ڈمگاتے تھے۔

۸۔ کئی بار کوشش کی گئی کہ آپ کو مخربین کی سازش کے جال میں پھنسایا جائے، لیکن آپ کبھی نہ بھنسنے، آپ فرماتے تھے: ”اگر سورج کو میرے ایک ہاتھ میں اور چاند کو دوسرا ہاتھ میں دیدیا جائے (یعنی پورے نظامِ شمس کو میرے قبضہ میں دے دیا جائے تاکہ میں اپنے مقصد سے دست بردار

ہو جاؤں) تو بھی میں اپنے مقصد سے دست بردار نہیں ہوں گا۔“

۹۔ آپ کی دعوت کا عام لوگوں کے افکار پر اثر نہ صرف عجیب تھا بلکہ اس کی سرعت بھی محض نہ تھی۔ جن لوگوں نے اسلام کے بارے میں مغربی مستشرقین کی لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان تمام مستشرقین نے اسلام کے تیزی کے ساتھ پھیلنے پر تجربہ کیا ہے مثال کے طور پر ”تاریخ تمدن عرب اور مشرق میں اس کی بنیادیں“ نام کی کتاب لکھنے والے مشہور تین مغربی مصنفوں اس حقیقت کا صریح طور سے اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”اس بات کو جاننے کے لئے اسلام کیسے اس قدر تیزی سے ترقی کر کے ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں اس زمانہ کی متعدد دنیا کے اکثر علاقوں پر چھا گیا؟ اب تک کی گئی تمام کوششوں کے باوجود بھی یہ راز ایک لا بخل معنے کی صورت میں باقی ہے۔“

جی ہاں حقیقت میں یہ ایک معما ہے کہ اس زمانہ کے وسائل کے ساتھ اسلام کس شرح اتنی تیزی اور سرعت کے ساتھ کروڑوں انسانوں کے دلوں کی گہرا یوں میں نفوذ کر گیا اور بہت سی تہذیبوں اور ثقافتوں کو ختم کر کے ایک نئی تہذیب و تمدن کو وجود میں لایا؟

۱۰۔ آخر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آپ کے دشمن کفر و استکبار کے سردار، ظالم اور خود خواہ سرمایہ دار تھے، جبکہ آپ پر ایمان لانے والے اکٹھا پاک دل جوان حق کے مثالی، محروم، مظلوم اور حتی غلام تھے۔ یہ ایسے افراد تھے جن کا سرمایہ سچائی اور پاک دل کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور وہ حق کے پیاسے تھے۔

ان بخنوں کے مجموعے سے کہ جس کی شرح بہت تفصیلی ہے، ہم آسمانی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آپ کی دعوت ایک الہی دعوت تھی، ایک ایسی دعوت تھی جس کا سرچشمہ ماورائے طبیعت تھا، یعنی ایک ایسی دعوت جس کو پروردگار عالم نے انسانوں کو برائی، تباہی، جہالت، شرک، ظلم اور ستم سے نجات دلانے کے لئے بھیجا تھا۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے :

- ۱۔ کیا پیغمبر اسلام ﷺ کی حقانیت کی پہچان کے لئے مجذہ کے علاوہ بھی کوئی طریقہ موجود ہے؟ وہ کون سا طریقہ ہے؟
- ۲۔ ”قرآن کی جمع آوری“ سے کس قسم کے قرآن مراد ہیں؟ اور کن امور کے بارے میں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت ہے؟
- ۳۔ کیا اسلام سے پہلے اور اس کے بعد عرب معاشرے کے درمیان موازنہ کرنے سے کوئی نتیجہ اخذ کیا سکتا ہے؟
- ۴۔ عصر جاہلیت میں دنیا بائن خصوص عربوں کے بارے میں اگر کچھ جانتے ہیں تو اس کا ایک خلاصہ بیان کیجئے۔
- ۵۔ اسلام کے دشمنوں نے پیغمبر اسلام ﷺ پر کیوں سحر کی تہمت لگائی؟

## دسوال سبق

پیغمبر اسلام ﷺ کا خاتم الانبیاء ہونا

خاتمیت کا صحیح مفہوم

پیغمبر اسلام ﷺ خداوند متعال کے آخری نبی ہیں اور نبوت کا سلسلہ آپ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ”دین اسلام کی ضروریات“ میں سے ہے۔ ”ضروری“ کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ جو بھی شخص مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہو جائے، جلدی ہی سمجھ لے گا کہ تمام مسلمان اس مطلب کا عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک واضح اور مسلم ہے۔ یعنی جس طرح کوئی شخص مسلمانوں سے سروکار رکھتا ہو، تو وہ جانتا ہے کہ مسلمان مذہبی لحاظ ہے ”توحید“ کی اصل پر سختی سے قائل ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تمام مسلمان پیغمبر اسلام ﷺ کے آخری نبی ہونے کے عقیدہ پر اتفاق رکھتے ہیں اور مسلمانوں کا کوئی گروہ کسی نئے نبی کے آنے کا منتظر نہیں ہے۔

حقیقت میں انبیاء کی بعثت کے ساتھ قافلہ بشریت نے اپنے تکامل کے مختلف مراحل کو یکے بعد دیگرے طے کیا ہے اور بالآخر انسان رشد و تکامل ایک ایسی

منزل پر پہنچ گیا ہے، جہاں پر وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ یعنی ”اسلام کی جامع تعلیمات“ سے استفادہ کر کے اپنی مشکلات کو حل کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، اسلام کمال بشریت کے دور کا آخری اور جامع قانون ہے۔ عقائد کے لحاظ سے دینی بصیرت کا مکمل نمونہ اور عمل کے حوالے سے بھی ایسا منظم قانون ہے جو ہر زمان و مکان میں انسان کی تمام ضروریات کے مطابق ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کی دلیل

اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے دلائل ہمارے پاس کئی موجود ہیں کہ ان میں سے واضح تدرج ذیل تین دلیلیں ہیں:

۱۔ اس مسئلہ کا ضروری ہونا: ہم نے کہا کہ جو بھی شخص دنیا کے مسلمانوں سے جہاں کہیں بھی رابطہ قائم کرے، اسے معلوم ہو گا کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے کے قائل ہیں۔ اس نے اگر کوئی شخص اسلام کو دلیل و منطق کی بنیاد پر قبول کرے، تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے آخری نبی ہونے کے عقیدہ کو بھی قبول کرے، کیونکہ ہم نے گزشتہ اس باقی میں اس دین کی حقانیت کو بہت سی دلیلوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے، لہذا پیغمبر اسلام ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے کے عقیدہ کو بھی قبول کرنا چاہئے، کیونکہ یہ اس دین کی ضروریات میں سے ہے۔

۲۔ قرآن مجید کی آیات بھی پیغمبر اسلام ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے پر واضح اور وشن دلیل ہیں، جیسے سورہ احزاب کی آیت نمبر ۳۰ میں ارشاد ہوا ہے: (ما كان محمدًا بآحدٍ مِّن رَّجُالِكُمْ وَلَكُنْ رَسُولَ اللَّهِ خاتَمُ النَّبِيِّنَ )

”محمد نتحمارے مردوں میں سے کسی ایک کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اور سلسلہ انبیاء کے خاتم ہیں“

قرآن مجید نے یہ تعبیر اس وقت پیش کی ہے جب عربوں میں مدنے بولا یہا بنا نے کاروائج تھا۔ وہ کسی دوسرے ماں باپ کے پچے کو اپنے بیٹے کے طور پر لے لیتے تھے اور وہ ایک حقیقی فرزند کے عنوان سے اس خاندان میں داخل ہوتا تھا، حرم ہوتا تھا اور وارث بن جاتا تھا۔

لیکن اسلام نے اس جاہل نہ رسم کو ختم کرتے ہوئے فرمایا: ”لے پاک پچے ہر گز حقیقی فرزندوں کی طرح شرعی اور حقوقی قوانین میں شریک نہیں ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک ”زید“ بھی تھے جن کی پرورش آنحضرت نے فرمائی تھی، وہ بھی آپؐ کے فرزند کہے جاتے تھے۔ لہذا قرآن مجید فرماتا ہے:

بجائے اس کے کہ تم لوگ پیغمبر اسلام ﷺ کو ان لوگوں میں سے کسی کے باپ کے عنوان سے پکارو آنحضرت کو دو اصلی اور حقیقی اوصاف یعنی ”رسالت“ و ”خاتمیت“ کے عنوان سے پکارو۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا آپؐ کی رسالت کے مانند سبوں کے لئے واضح، ثابت اور مسلم تھا۔ صرف یہ سوال باقی ہے کہ ”خاتم“ کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

”خاتم“، ”ختم“ سے بنتا ہے۔ اس کا معنی ختم کرنے والا اور وہ جیز ہے جس کے ذریعہ کسی کام کو ختم کیا جائے۔ مثلاً ہر خط کے اختتام پر لکائی جانے والی مہر کو ”ختم“ کہتے ہیں۔ انگوٹھی کو بھی اس لئے ”ختم“ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں انگوٹھی کا گنیہ کو مہر کی جگہ پر استعمال کیا جاتا تھا، ہر ایک اپنے خط کے آخر پر اپنی انگوٹھی کے گنیہ سے مہر لگاتا تھا، جس پر اس کا نام یا کوئی اور نقش کندہ ہوتا تھا، ہر ایک کی انگوٹھی کا نقش اس شخص سے مخصوص ہوا کرتا تھا۔

اسلامی روایات میں مذکور ہے: جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس زمانہ کے کسی بادشاہ یا حکمران کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے خط لکھنا چاہتے تھے، تو آپؐ کی خدمت میں عرض کی گئی کہ عموم کے بادشاہ مہر کے بغیر خط کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت تک بالکل سادہ اور مہر کے بغیر خط تحریر فرماتے تھے۔ اس تجویز کے بعد آپؐ نے حکم فرمایا کہ آپؐ کے لئے ایک ایسی انگوٹھی بنائی جائے جس کے گنیہ پر کلمہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا

الحمد لله رب العالمين، نعمتني بآياته وآياته ملائكة خاتم الأنبياء عليه وآله وسلمه سلام علیه وآلہ وسلم کے حکم سے تمام خطوط پر یہ مہر لگائی جاتی تھی۔  
اس لئے ”خاتم“ کا اصلی معنی ختم کرنے والا آخر تک پہنچانے والا ہے۔

۳۔ بہت سی ایسی روایتیں بھی پائی جاتی ہیں جن سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے۔ ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

الف: جابر بن عبد اللہ انصاری سے نقل کی گئی ایک معتبر حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:  
”انبیاء کے درمیان میری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے ایک خوبصورت عمارت تعمیر کی ہو، لیکن اس عمارت میں ایک جگہ صرف ایک اینٹ لگانا باتی ہو، جو بھی اس عمارت میں داخل ہوتا ہے، اس خالی جگہ پر نظر ڈالتے ہی کہتا ہے: کتنی خوبصورت ہے یہ عمارت لیکن ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے۔ میں وہی آخری اینٹ ہوں اور نبوت کا سلسلہ مجھ پر ختم ہو گیا ہے۔“ (تفسیر مجھ العبیان)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”حلال محمد حلال أبداً لليوم القيمة وحرامه حرام أبداً لليوم القيمة.“

”حلال محمد ہمیشہ ہمیشہ قیامت تک حلال ہے اور حرام محمد ہمیشہ ہمیشہ قیامت تک حرام ہے“ (اصول کافی، ج ۱، ص ۵۸)  
شیعہ اور سیّر راویوں سے نقل کی گئی ایک مشہور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرمایا:  
”انت مني بمنزلة موسى من موسي لا آنذاك بعدي“

”آپ کی میرے ساتھ وہی نسبت ہے، جوہار و میں کی حضرت موسیٰ سے تھی، صرف یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔“  
اس قسم کی دسیوں احادیث موجود ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کے سلسلہ میں کچھ سوالات ایسے ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے:  
پہلا سوال :

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر انبیاء کی بعثت خدا کی طرف سے ایک بڑا فیض ہے، تو ہمارے زمانے کے لوگ کیوں اس عظیم فیض و برکت سے محروم ہیں؟ اسی زمانہ کے لوگوں کی بدایت و رہنمائی کے لئے کیوں ایک نئے راہنماؤں کو نہیں بھیجا جاتا؟

جواب: ایسا کہنے والے حقیقت میں ایک اہم نکتہ سے غافل ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں کسی نبی کے مبعوث نہ ہونے کا سبب اس زمانہ کے لوگوں کا بے لیاقت اور نااہل ہونا نہیں ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ قافلہ بشریت علم و فکر کے لحاظ سے ایک ایسی منزل تک پہنچ گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے استفادہ کر کے خود آگے بڑھ سکتا ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لئے ہم یہاں پر ایک مثال پیش کرتے ہیں: اولوا العزم نبی، یعنی صاحب شریعت اور صاحب کتاب نبی، پائچ ہیں: ”حضرت نوح، حضرت ابراھیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ علیہم السلام“۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک خاص زمانے میں لوگوں کی بدایت اور ان کے رشد و تکامل کے لئے بنتک کوششیں کی ہیں اور قافلہ بشریت کو ایک مرحلہ سے گزار کر دوسرے مرحلہ میں ایک دوسرے اولوا العزم پیغمبر کے حوالے کیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ قافلہ اپنی آخری منزل تک پہنچ کر اس قابل ہو گیا کہ خود اپنے راستے پر آگے بڑھ سکے۔ اس کی مثال

اس طالب علم کی ہے جو اپنی تعلیم کے مختلف پانچ مراحل طے کر کے فارغ التحصیل ہوتا ہے: (البتہ فارغ التحصیل ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ اس سے مراد اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر سفر کو جاری رکھنا ہے) تعلیم کے یہ پانچ مراحل حسب ذیل ہیں:

پہاڑی، مڈل، ہائی سینڈری، گریجویشن (بی اے اور ایم اے) اور ڈاکٹریٹ۔

اگر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کیا ہوا ایک شخص سکول یا یونیورسٹی نہیں جاتا ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں صلاحیت نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ وہ اس قدر علم و آگاہی رکھتا ہے کہ جس کی مدد سے وہ اپنی علمی مشکلات کو حل کر سکتا ہے اور اپنے مطالعات کو جاری رکھتے ہوئے ترقی کے مراحل طے کر سکتا ہے۔

دوسرے اسوال:

چونکہ انسانی معاشرہ ہمیشہ تغیر و تبدل کی حالت میں ہوتا ہے، اس لئے یہ ممکن ہے کہ اسلام کے مستقل ثابت اور یکساں قوانین معاشرے کی ضروریات کا حل پیش کر سکیں؟

جواب: اسلام میں دو قسم کے قوانین ہیں: پہلی قسم ان قوانین پر مشتمل ہے جو انسان کی خاص صفات کے مانند مستقل اور ثابت ہیں، جیسے: توحید پر اعتقاد، عدالت کے اصول کا نفاذ، اور ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے مقابلہ کرنا وغیرہ۔

ان قوانین کی دوسری قسم کی اور جامع اصولوں کے ایک سلسلہ پر مشتمل ہے جو موضوعات میں تبدیلی پیدا ہونے سے نئی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ہر زمانے کی تغیر پذیر ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

مثلاً اسلام میں ”ادنوبالعقود“ کے عنوان سے ایک کلی قاعدہ ہے۔ (یعنی اپنے عہد و بیان کی وفاداری کرتے ہوئے انھیں پورا کرو) زمانہ کے گزرنے کے ساتھ یقیناً نئے اور مفید تجارتی، سیاسی اور اجتماعی معاهدات و معاملات پیش آتے ہیں۔ انسان مذکورہ کلی قوانین کو مد نظر رکھتے ہوئے جدید مسائل کا جواب دے سکتا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرا قائدہ بنام ”قائدہ لا ضرر“ ہے۔ اس قائدہ کے مطابق جو بھی حکم اور قانون انسان یا معاشرہ کے لئے مضر ہوا سے محدود ہو ناچاہئے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اسلام کے کلی قاعدے کس قدر مسائل کو حل کرنے میں کار ساز ہیں۔ اسلام میں اس قسم کے قاعدے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ہم انہی کلی قواعد اور اصول سے استفادہ کر کے عظیم اسلامی انقلاب کے بعد (بلکہ ہمیشہ) پیچیدہ ترین مسائل اور مشکلات کو حل کر سکتے ہیں۔

تیسرا اسوال :

بیشک ہمیں اسلامی معاشرے میں مختلف مسائل کے سلسلہ میں رہبر کی ضرورت ہے۔ پنجیگانی عدم موجودگی اور ان کے جانشین کی غیبت کے پیش نظر رہبری کا مسئلہ معطل ہو کر رہ گیا ہے، اور خاتمیت کے اصول کے پیش نظر کسی دوسرے نبی کے مبعوث ہونے کی امید بھی نہیں کی جاسکتی ہے، کیا یہ امر اسلامی معاشرہ کے لئے نقصان دہ نہیں ہے؟

جواب: اس زمانہ کے لئے بھی اسلام میں ضروری را حل کو مد نظر رکھا گیا ہے، یعنی ”ولایت فقیہ“ کے ذریعہ اسلامی معاشرے کی رہبری کی ذمہ داری جامع الشرکاء اور اعلیٰ سطح پر علم و تقویٰ اور سیاسی سوجہ بوجھ رکھنے والے ایک فقیہ کے ذمہ رکھی گئی ہے۔ ایسے رہبر کی پہچان کا طریقہ بھی اسلامی قوانین

میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے، لہذا اس سلسلہ میں بھی کسی قسم کی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔  
اس بنابر ”ولایت فقیہ“ سلسلہ انبیاء و اوصیاء ہی کی ایک کڑی ہے۔ ”جامع الشرائع فقیہ کی رہبری“ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی معاشرہ سرپرست اور رہبر سے محروم نہیں ہے۔  
(اس سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لئے مصنف کی فارسی کتاب ”طرح حکومت اسلامی“ کا مطالعہ فرمائیں)۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ خاتمت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟
- ۲۔ قرآن مجید کی آیات سے خاتمت کو کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟
- ۳۔ ہمارے زمانہ کے لوگ انبیائے اللہ کی بعثت سے کیوں محروم ہوں؟
- ۴۔ اسلامی قوانین کی کتنی قسمیں ہیں یہ قوانین ہمارے زمانہ کے مسائل کو کیسے حل کر سکتے ہیں؟
- ۵۔ کیا اسلامی معاشرہ رہبر کے بغیر قائم رہ سکتا ہے؟ ہمارے زمانہ میں رہبری کا مسئلہ کیسے حل کیا جاسکتا ہے؟

امامت  
کے  
دس سبق

پہلا سبق

امامت کی بحث کب سے شروع ہوئی؟

ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے:

ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا ہے، اور یہ امام امت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ مل بیٹھ کر اپنے درمیان میں سے کسی ایک کو رہبر کے عنوان سے منتخب کریں۔ اس گروہ کو ”اہل سنت“ کہتے ہیں۔

دوسرਾ گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین آپکے ہی مانند خطاؤ گناہ سے معصوم ہونا چاہئے اور بے پناہ علم کا حامل ہونا چاہئے تاکہ لوگوں کی معنوی و مادی رہبری کی ذمہ داری سنہjal سکے اور اسلام کے اصولوں کی حفاظت کرتے ہوئے انھیں بقائی۔

ان کا عقیدہ ہے کہ ان شرائط کے حامل جانشین کا انتخاب خدا کی طرف سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہی ممکن ہے، اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کام انجام دیا ہے اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے۔ اس گروہ کو ”امامیہ“ یا ”شیعہ“ کہتے ہیں۔

ان مختصر مباحث سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس سلسلہ کے سلسلہ میں عقلی، تاریخی اور قرآن و سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلائل کی روشنی میں بحث و تحقیق کریں۔ لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ہم چند نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

کیا یہ بحث اختلاف پیدا کرنے والی ہے؟

جب امامت کی بحث چھڑتی ہے تو بعض لوگ فوراً یہ کہتے ہیں کہ آج کل ان باتوں کا زمانہ نہیں ہے!

آج مسلمانوں کے اتحاد و پیگھتی کا زمانہ ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کا سلسلہ پر گفتگو کرنا اختلاف و افتراق پیدا ہونے کا سبب بن سکتا ہے!

آج ہمیں اپنے مشترک دشمنوں کے بارے میں سوچنا چاہئے، جیسے: صہیونزم اور مشرق و مغرب کی استعماری طاقتیں۔ اس لئے ہمیں اس اختلافی سلسلہ کو پس پشت ڈالنا چاہئے۔ لیکن یہ طرز فکر یقیناً غلط ہے، کیونکہ:

ا۔ جو چیز اختلاف و افتراق کا سبب بن سکتی ہے، وہ تعصب پر منی غیر معقول بحث اور کینہ پر ور جھگڑے ہیں۔ لیکن مخلصانہ اور دوستانہ ماحول میں، تعصب، ہٹ دھرمی اور لڑائی جھگڑوں سے پاک عقلی و استدلال بھی نہ صرف اختلاف انگیز نہیں ہیں، بلکہ باہمی فاسلوں کو کم اور مشترک نقطہ نظر کو تقویت بخشتی ہیں۔

میں نے اپنے حج و زیارت کے سفروں کے دوران متعدد بار جماز کے اہل سنت علماء اور دانشوروں سے اس سلسلہ میں بھی تھیں کی ہیں۔ ہم دونوں فریق محسوس کرتے تھے کہ یہ بھی نہ صرف ہمارے تعلقات پر برا اثر نہیں ڈالتی تھیں بلکہ زیادہ سے زیادہ آپسی افہام و تفہیم اور خوش فہمی کا سبب بھی بنتی تھیں۔ یہ بھی ہمارے آپسی فاسلوں کو کم کرتی ہیں اور اگر کوئی بغض و عناد ہو تو اسے دلوں سے پاک کر دیتی ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ان بھتوں کے دوران واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے درمیان مشترک نقطہ نظر کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ہم ان مشترک نظریات پر اعتماد اور بھروسہ کر کے اپنے مشترک دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

خود اہل سنت بھی چار مذاہب میں تقسیم ہوئے ہیں (حنفی، حنبلی، شافعی اور مالکی) ان چار مذاہب کا وجود ان میں اختلاف کا سبب نہیں بنتا ہے اگر وہ شیعہ فقہ کو کم پانچویں فقہی مذہب کے عنوان سے قبول کریں گے تو بہت سے اختلافات اور مشکلات دور ہو جائیں گے، جیسا کہ ماضی قریب میں اہل سنت کے عظیم مفتی اور مصر کی الازہر یونیورسٹی کے سربراہ ”شیخ شلتوت“ نے اہل سنت کے درمیان فقہ شیعہ کا باضافہ طور پر اعلان کر کے ایک بلا اور موثر قدم اٹھایا۔ انہوں نے اس طرح اسلامی افہام و تفہیم کے حق میں ایک بڑی اور مؤثر خدمت کی جس کے نتیجہ میں شیخ شلتوت اور عالم تشیع کے مرجع عالیقہر

آیت اللہ اعظمی مر حوم برو جردی کے درمیان دوستانہ تعلقات برقرار ہوئے۔

۲۔ ہمارا عتقاد ہے کہ دوسرے مذاہب سے زیادہ شیعہ مذہب میں اسلام کی تخلی و واضح صورت میں موجود ہے۔ ہم تمام مذاہب کا احترام کرتے ہوئے عقیدہ رکھتے ہیں کہ مذہب شیعہ اسلام کو تمام جہات میں بہتر صورت میں پکچنا سکتا ہے اور اسلامی حکومت سے متعلق مسائل کو حل کر سکتا ہے۔

تو پھر کیوں نہ ہم اپنے بچوں کو دلیل و منطق کے ساتھ اس مکتب کی تعلیم دیں؟ اور اگر ایسا نہ کیا تو یقیناً ہم ان کے ساتھ خیانت کریں گے۔

ہمیں یقین ہے کہ پیغمبر اسلام نے قطعاً اپنے جانشین کو معین فرمایا ہے، اس میں کیا مشکل ہے کہ عقل و منطق اور دلیل و برهان سے اس موضوع پر بحث کریں؟

لیکن ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس بحث کے دوران دوسروں کے مذہبی جذبات کو مجرور نہ کریں۔

۳۔ اسلام کے دشمنوں نے، مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کے لئے سنیوں میں شیعوں کے خلاف اور شیعوں میں سنیوں کے غلاف اس قدر جھوٹ اور تمہیں پھیلانی ہیں کہ جس کے نتیجہ میں بعض ممالک میں تمام شیعہ اور سنی ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں۔

جب ہمامamt کے مسئلہ کو مذکورہ ذکر شدہ طریقے سے بیان کریں گے اور شیعوں کے نقطہ نظر کو قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں دلائل سے واضح کریں گے، تو معلوم ہو گا کہ یہ جھوٹا پر و پیگنڈا تھا اور ہمارے مشترک دشمنوں نے زہر چھڑ کا ہے۔

مثال کے طور پر میں یہ کبھی بھول نہیں سکتا کہ ایک عظیم دینی شخصیت سے میری ملاقات اور بحث ہوئی۔ اس نے اظہار کیا: ”میں نے سنا ہے کہ شیعوں کا قرآن ہمارے قرآن سے الگ ہے۔“

میں نے انہائی تجھ کے ساتھ اس سے کہا: میرے بھائی اس بات کی تحقیق کرنا بہت آسان ہے۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ خود یا آپ کا نام سننہ میرے ساتھ آئے تاکہ ” عمرہ“ کے بعد کسی پیشگی اطلاع کے بغیر ایران چلیں وہاں کے تمام کوچہ و بازار میں مسجدیں ہیں اور ہر مسجد میں بڑی تعداد میں قرآن مجید موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تمام مسلمانوں کے گھروں میں بھی قرآن مجید موجود ہیں۔ آپ جس مسجد میں چاہیں گے ہم چلیں گے یا جس گھر میں چاہیں اس گھر کا دروازہ کھلکھلائیں گے اور ان سے قرآن مجید طلب کریں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپ کے اور ہمارے قرآن میں ایک نقطہ کا بھی اختلاف نہیں ہے۔ (بہت سے قرآن مجید، جن سے ہم استفادہ کرتے ہیں خود عربستان، مصر اور دنیا کے دوسرے اسلامی ممالک سے شائع ہوئے ہیں)

پیشک اس دوستانہ اور نہایت استدلالی بحث کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام کے دشمنوں نے اس مشہور عالم دین کے ذہن میں جو عجیب زہر افشا نی کر رکھی تھی، اس کا اثر ختم ہو گیا۔

مقصود یہ ہے کہ امامت سے مربوط بکشیں، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، اسلامی معاشرے میں اتحاد و اتفاق کو مستحکم کرتی ہیں اور حقائق کے واضح ہونے اور فاصلے کم ہونے میں مدد کرتی ہیں۔

امامت کیا ہے؟

جیسا کہ عنوان سے ہی واضح ہے کہ ”امام“ مسلمانوں کے پیشو اور قائد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور شیعوں کے اصول عقائد کے اعتبار سے ”امام معصوم“ اسے کہا جاتا ہے جو ہر چیز میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین ہو، اس فرق کے ساتھ کہ پیغمبر مذہب کا بانی ہوتا ہے اور امام مذہب کا محافظ و

گنہیاں ہوتا ہے۔ پیغمبر پر وحی نازل ہوتی ہے لیکن امام پر وحی نازل نہیں ہوتی ہے۔ امام پیغمبر سے تعلیمات حاصل کرتا ہے اور قدرت کی طرف سے غیر معمولی علم کا حامل ہوتا ہے۔

شیعہ عقیدہ کے مطابق ”امام معصوم“ حکومتِ اسلامی کا صرف رہبر ہی نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ معنوی و مادی، ظاہری و باطنی، غرض ہر جہت سے اسلامی معاشرے کا رہبر اور قائد ہوتا ہے، وہ اسلامی عقائد و احکام کا گنہیاں اور محافظ ہوتا ہے اور ہر قسم کے خطاو اخراج سے محفوظ ہوتا ہے اور وہ خدا کا منتخب بندہ ہوتا ہے۔

لیکن اہل سنت، امامت کی اس طرح تفسیر نہیں کرتے ہیں، بلکہ وہ اسے صرف اسلامی معاشرہ کا سر برہا جانتے ہیں، اور دوسرے الفاظ میں وہ ہر عصر و زمانہ کے حکمرانوں کو پیغمبر کا خلیفہ اور مسلمانوں کا امام جانتے ہیں۔

البتہ ہم آئندہ بحثوں میں ثابت کریں گے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک الٰہی نمائندہ کا ہونا ضروری ہے یعنی پیغمبر یا ایک معصوم امام روئے زمین پر ضرور موجود ہونا چاہئے تاکہ دین حق کی حفاظت اور طالبان حق کی رہبی کرے۔ اور اگر کبھی یہ امام معصوم کسی مصلحت کے پیش نظر لوگوں کی نظر وہ سے غائب ہو جائے تو اس کی طرف سے اس کے نمائندے احکام الٰہی کی تبلیغ اور حکومتِ اسلامی کی تشکیل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

### غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج کل امامت کی بحث کرنا مناسب نہیں ہے ان کی دلیل کیا ہے۔

۲۔ اس دلیل کے مقابلے میں اس بحث کی ضرورت کے لئے ہمارے پاس کتنے مندرجہ جواب ہیں؟

۳۔ اسلام کے دشمن مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو کیسے پھیلاتے ہیں اور ان اختلافات کو دور کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

۴۔ کیا آپ دشمنوں کی تفرقہ اندازی کے کچھ نمونے پیش کر سکتے ہیں؟

۵۔ شیعہ مکتب میں ”امامت“ کے کیا معنی ہیں اور اس کا سنی مکتب میں ”امامت“ کے معنی سے کیا فرق ہے؟

## دوسرا سبق

امام کے وجود کا فلسفہ

بعثت انیاء کی ضرورت کے موضوع پر جو بحث ہم نے کی اس سے کافی حد تک ہمارے لئے پیغمبر کے بعد امام کی ضرورت کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ نیا اور امام اکثر موضوعات میں مشترک ہیں، لیکن یہاں پر ضروری ہے کہ کچھ دوسرے موضوعات پر بھی روشنی ڈال جائے:

اللی رہروں کے وجود کے ساتھ معنوی تکال

سب سے پہلے ہمیں انسان کی خلقت کے مقصد پر بحث کرنی چاہئے کیونکہ یہ گلدستہ کائنات کا سب سے اچھا بھول ہے۔

انسان خدا کی طرف، تمام جہات میں کمال مطلق اور معنوی تکال کی منزل تک پہنچنے کے لئے ایک طولانی اور نشیب و فراز سے پر راستہ طے کرتا ہے۔

بیشک انسان اس راستہ کو ایک معصوم پیشوائی رہبری کے بغیر طے نہیں کر سکتا ہے اور اس کے لئے ایک اللی معلم کی رہبری کے بغیر یہ منزل طے کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ ”اس راہ میں تاریکیاں اور گمراہی کے خطرات موجود ہیں۔“

یہ صحیح ہے کہ خداوند متعال نے انسان کو عقل و شعور کی قوت سے نوازا ہے اور اسے محکم اور قوی ضمیر عطا کیا ہے، اس کے لئے آسمانی کتابیں بھیجی ہیں۔ لیکن ممکن ہے یہ انسان ان تمام تکونیٰ اور تشریعی وسائل کے باوجود اپنے لئے صحیح راہ کی شناخت کرنے میں غلطی کا شکار ہو جائے۔ بیشک ایک معصوم پیشوائخراف اور گمراہی کے خطرات کو دور کر دیتا ہے۔ لہذا ”امام کا وجود انسان کی تخلیق کے مقصد کو مکمل کرنے والا ہے۔“

یہ وہی جیز ہے جسے عقائد کی کتابوں میں ”قاعدہ لطف“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ”قاعدہ لطف“ سے مراد یہ ہے کہ خداوند متعال ان تمام چیزوں کو انسان کے اختیار میں دیتا ہے جو اس کو تخلیق کے مقصد تک پہنچنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ انیاء کی بعثت اور امام معصوم کا وجود بھی ان ہی میں سے ہے ورنہ انسان کے مقصد خلقت کی مخالفت لازم آئے گی۔ (غور فرمائیں)۔

آسمانی ادیان کی حفاظت

ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جب اللی ادیان انیاء کے قلوب پر نازل ہوتے ہیں تو وہ بارش کے پانی کی بوندوں کے مانند صاف و شفاف حیات بخش اور روح پرور

ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ آسودہ ماحول اور کمزور یا تاپاک ذہنوں میں وارد ہوتے ہیں تو فترتہ آسودہ ہو جاتے ہیں اور خرافات و توهہات ان میں اس قدر مخلوط ہو جاتے ہیں کہ ان کی بنیادی پائیزگی اور لطافت ختم ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں نہ ان میں جذبیت باقی رہتی ہے اور نہ تربیت کا خاص اثر، نہ ہی یہ ادیان پیاسوں کو سیراب کر سکتے ہیں اور نہ ان میں فضائل و کمالات کی کلیاں اور پھول کھلا سکتے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ دین و مذہب کی اصلی شکل کی حفاظت اور دینی اصول و ضوابط کے خاص رہنے کے لئے ایک معصوم پیشوام موجود ہوتا کہ وہ انحرافات، غلط افکار، غلط اور اجنبی نظریات، توهہات و خرافات سے دین کو بچاسکے۔ اگر دین و مذہب ایسے رہرسے محروم ہو گا تو وہ دین مختصر مدت کے اندر ہی اپنی حقیقی شکل اور پائیزگی کو کھو دے گا۔

اسی لئے حضرت علی علیہ السلام فتح البلاعہ میں فرماتے ہیں:

”اللَّهُمَّ لَا تَخْلُو الْأَرْضُ مِنْ قَاعِمٍ سَادِحِيْبٍ، إِنَّا طَاهِرٌ مُّشْهُورٌ، وَإِنَّا لَغَلِيلٌ مُغْنُورُ الْمُلَاقِتِ بَطْلُ حَجَّ الْمُلْكِ بِينَتٍ۔“ (فتح البلاعہ، کلمات قصار نمبر ۷) (۱۲)

”جی ہاں، زمین ہر گز قیام کرنے والے جنت خدا سے خالی نہیں ہو سکتی ہے، خواہ (وہ جنت خدا) ظاہر و آشکار ہو یا مخفی و پوشیدہ، تاکہ خدا کی واضح دلیلیں اور نشانیاں باطل نہ ہونے پائیں۔“

حقیقت میں قلب امام اس محفوظ صندوق کے ماندہ ہے جس میں ہمیشہ گراں قیمت اسناد کے جاتے ہیں تاکہ چوروں کی لوٹ مار اور دوسرا سے حادث سے محفوظ رہیں یہ بھی وجود امام کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ ہے۔

امت کی سیاسی و اجتماعی رہبری اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کوئی بھی معاشرہ یا گروہ ایک ایسے اجتماعی نظام کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا ہے جس کی سر پرستی ایک تواناہ ہبہ کرتا ہو۔ اسی لئے زمانہ قدیم سے آج تک تمام اقوام و ملل نے اپنے لئے ایک رہبر کو منتخب کیا ہے۔ کبھی یہ رہبر صلح ہوتا تھا لیکن، بہت سے موقع پر ناصالح ہوتا تھا۔ اکثر موقع پر امتوں کی ایک رہبر کی ضرورت اور احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ظالم بادشاہ اور سلاطین زور و زبردستی سے لوگوں پر مسلط ہو کر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے... یہ ایک طرف۔

دوسری طرف انسان کو اپنے معنوی کمال کے مقصد تک پہنچنے کے لئے اس راستہ کو اکیلے ہی نہیں بلکہ جماعت اور معاشرہ کے ہمراہ طے کرنا چاہئے۔ کیونکہ فکری، جسمانی، مادی اور معنوی لحاظ سے انفرادی طاقت کمزور ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں اجتماعی طاقت بہت قوی ہوتی ہے۔

لیکن ایک معاشرے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں ایک ایسا صحیح نظام حکم فرمایو، جو انسانی صلاحیتوں میں نکھار لائے، انحرافات اور گمراہیوں سے مقابلہ کرے، معاشرے کے تمام افراد کے حقوق کا تحفظ کرے، بلند مقاصد تک پہنچنے کے لئے پروگراموں کو منصوبہ بند طریقے پر منظم کرے اور ایک آزاد ماحول میں پورے معاشرے کو حرکت میں لانے کے عوامل بیکارے۔

چونکہ ایک خطکار انسان میں ایسی عظیم ذمہ داری سنبھالنے کی صلاحیت اور طاقت نہیں ہے، جیسا کہ ہم ہمیشہ صحیح راستے سے سیاسی حکمرانوں کے انحراف اور گمراہی کا مشاہدہ کرتے رہے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ خداوند متعال کی طرف سے ایک معصوم رہبر ان امور کی فخرانی و نظارت کرے اور لوگوں کی توانائیوں اور دانشوروں کے افکار سے استفادہ کرتے ہوئے انحرافات کی بھی روک خام کرے۔

یہ امام کے وجود کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ اور ”قاعدہ لطف“ کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔ ہم مرر عرض کر رہے ہیں کہ اشتہائی زمانہ میں

بھی، جب امام معموم کچھ وجوہات کی وجہ سے غائب ہوں تو لوگوں کی ذمہ داریاں واضح ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ہم ”حکومت اسلامی“ کی بحث میں اس پر مفصل روشنی ڈالیں گے۔

### اتمام حجت کی ضرورت

امام کے وجود کی نورانی کرنوں سے صرف آمادہ لوں کی رہنمائی ہی مقصد نہیں ہے تاکہ وہ کمال مطلق کے راستے پر گامز نہیں بلکہ امام کا وجود ان لوگوں کے لئے بھی حجت کے طور پر ضروری ہے، جو جان بوجھ کر گمراہی کی طرف جاتے ہیں، تاکہ ان کے ساتھ وعدہ کی گئی سزا بے دلیل نہ ہو اور کوئی شخص ایسا اعتراض نہ کر سکے، کہ اگر کسی اللہ رہبر نے ہماری رہنمائی کرتے ہوئے ہمیں حق کی طرف دعوت دی ہوتی تو ہم ہرگز گمراہ نہ ہوتے۔  
مختصر یہ کہ امام کے وجود کا مقصد یہ ہے کہ عذر اور بہانہ کے تمام راستے بند کر دیئے جائیں، حق کی دلیلیں کافی حد تک بیان کی جائیں، نااگاہ لوگوں کو آگاہی فراہم کی جائے اور آگاہ افراد کو اطمینان دلا کر ان کے ارادہ کو تقویت بخشنی جائے۔

اماں، فیض اللہ کا عظیم وسیلہ ہے

بہت سے علماء، اسلامی احادیث کی روشنی میں، انسانی معاشرہ یا تمام کائنات میں پیغمبر اور امام کے وجود کو انسان کے بدن میں ”قلب“ کے وجود سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ہم بخوبی جانتے ہیں کہ دل کی دھڑکن کے نتیجہ میں خون تمام رگوں میں پہنچ جاتا ہے اور اس طرح بدن کی تمام خلیوں کو غذا پہنچتی ہے۔  
چونکہ امام معموم ایک انسان کامل اور کاروان انسانیت کے رہنمائی حیثیت سے فیض اللہ کے نازل ہونے کا وسیلہ ہے اور ہر شخص پیغمبر و امام سے اپنے ارتباط کے مطابق اس فیض اللہ سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ لہذا یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح انسان کے لئے ”دل“ کا وجود ضروری ہے اسی طرح عالم انسانیت کے لئے فیض اللہ کے اس وسیلہ (امام) کا ہونا بھی ضروری ہے۔ (غور فرمائیے)

مغالطہ نہ ہو، پیغمبر اور امام کے پاس اپنی کوئی ایسی کیزیں نہیں ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کو عطا کریں، بلکہ ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے، لیکن جس طرح ”دل“ بدن کے لئے فیض اللہ کا وسیلہ ہوتا ہے، اسی طرح پیغمبر اور امام بھی تمام انسانوں کے لئے فیض اللہ کے سبب اور وسیلہ ہوتے ہیں۔

## غور کچھ اور جواب دیجئے

- ۱۔ انسان کے معنوی تکامل میں امام کا کیا کردار ہے؟
- ۲۔ دین و مذہب کے محافظ کی حیثیت سے امام کا کیا کردار ہے؟
- ۳۔ حکومت اور نظام کی رہبری کے لحاظ سے امام کا کیا کردار ہے؟
- ۴۔ اتمام جنت سے کیا مراد ہے؟ اور اس سلسلہ میں امام کا کیا کردار ہے؟
- ۵۔ فیض اللہ کے وسیلہ سے کیا مراد ہے؟ اس حوالے سے پیغمبر اور امام کے بارے میں کون سی تشبیہ بہترین تشبیہ ہے؟

## تیسرا سبق

### امام کے خاص شرائط و صفات

اس بحث میں سب سے پہلے اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے: قرآن مجید سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ”امامت کا مرتبہ“ ایک ایسا بلند مرتبہ ہے کہ ممکن ہے ایک انسان اس مرتبہ تک پہنچ سکے۔ یہاں تک کہ یہ مرتبہ ”نبوت“ اور ”رسالت“ کے مرتبہ سے بھی بلند تر ہے۔ کیونکہ بت شکن پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۲ میں ارشاد ہوا ہے:

(وَإِذَا أَتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبَّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ رَبِّيْنِي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ امَّاً قَالَ وَمِنْ ذَرِّيَّتِيْ قَالَ لَا يَنْهَا عَمَدُ الْعَلَمِينَ )

”اور اس وقت کو یاد کرو جب خدا نے چند کلمات کے ذریعہ ابراھیمؐ کا متحان لیا اور انہوں نے اسے پورا کر دیا تو اس (خدا) نے کہا تم تم کو لوگوں کا امام اور قائد بنا رہے ہیں۔ انہوں نے عرض کی: میری ذریت؟ ارشاد ہو یہ عہدہ امامت ظالمیں تک نہیں جائے گا۔“

اس طرح حضرت ابراھیمؐ، نبوت اور رسالت کام مرحلہ طے کرنے اور خدا کی طرف سے لئے گئے مختلف امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد لوگوں کی ظاہری و باطنی اور مادی و معنوی پیشواں کے بلند مرتبہ (امامت) پر فائز ہوئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی نبوت و رسالت کے مرتبہ کے علاوہ لوگوں کی امامت و رہبری کے مرتبہ پر فائز تھے، بعض انبیاء علیہ السلام بھی اس مرتبہ پر فائز تھے، یہ ایک طرف۔

دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ کسی عہدہ کو سنبھالنے والے میں فرانض اور ذمہ دار یوں کے مطابق شرائط اور صفات کا ہونا ضروری ہے یعنی جس قدر مرتبہ بلند تر اور ذمہ دار یا سنگین تر ہوں گی اسی تناسب سے ضروری شرائط اور صفات سنگین تر ہوں گی۔

مثلاً اسلام میں قاضی اور نجج کے عہدہ پر فائز ہونے، حتیٰ گواہی دینے اور امام جماعت بننے کے لئے بھی عادل ہونا ضروری ہے۔ جس مذہب میں ایک گواہی دینے یا نماز جماعت میں حمد و سورہ پڑھنے کی ذمہ داری نجھانے والے کے لئے عادل ہونا ضروری ہو، ظاہر ہے اس میں امامت کے جیسے غیر معمول اور بلند مرتبہ پر فائز ہونے کے لئے کن شرائط کا ہونا ضروری ہو گا۔

بہر حال امام کے لئے درج ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے :

۱۔ معصوم ہونا: امام کو پیغمبر کے مانند معصوم ہونا چاہئے یعنی اسے خط اور گناہوں سے پاک ہونا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہو گا تو وہ لوگوں کے لئے رہبر اور نمونہ نہیں بن سکتا ہے اور معاشرے کے لئے قابلِ اعتماد نہیں بن سکتا ہے۔

امام میں ایسی خصوصیات ہونی چاہئیں کہ لوگوں کے دل و جان پر حکمرانی کر سکے اور اس کا حکم کسی چون وچراکے بغیر لوگوں کے لئے قابلِ قبول ہونا چاہئے۔ جو شخص گناہوں میں آلوہ ہو گا وہ بھی ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا اور ایسی مقبولیت پیدا نہیں کر سکتا۔

جو شخص اپنے روزمرہ کاموں میں غلطیوں اور خطاؤں کام تکب ہوتا ہو، اس کے لئے کیسے ممکن ہے کہ معاشرے کے امور میں اس کے انکار و نظریات پر اعتماد کرتے ہوئے کسی چون وچراکے بغیر عمل کیا جائے؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر کو معصوم ہونا چاہئے، امام میں بھی اس شرط کا ہونا مندرجہ بالا دلیل کے مطابق ضروری ہے۔ اس بات کو ایک اور طریقہ سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے، وہ طریقہ ”قاعدہ لطف“ ہے۔ کہ پیغمبر و امام کے وجود کی اصل کا انحصار اسی قاعدہ پر ہے اور یہ قاعدہ عصمت کی صفت کو بھی ضروری قرار دیتا ہے، کیونکہ پیغمبر و امام کے مقاصد کی تکمیل مرتبہ عصمت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ سبق میں جو وجود امامؐ کے فلسفے ہم نے بیان کئے ہیں وہ بھی اس (صفت عصمت) کے بغیر ناکمل رہیں گے۔

۲۔ بھرپور علم: امام، پیغمبر کے مانند لوگوں کے لئے علمی مامن اور پناہ گاہ ہوتا ہے۔ وہ تمام اصول دین، فروع دین، قرآن مجید کے ظاہر و باطن، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور جو کچھ اسلام سے مریبو ط ہے ان سب کے بارے میں مکمل طور پر آگاہ و عالم ہونا چاہئے کیونکہ وہ شریعت اسلام کا محافظ بھی ہوتا ہے اور لوگوں کا رہبر و قاعدہ بھی ہوتا ہے۔

جو اشخاص، پیچیدہ اور مشکل مسائل پیش آنے کی صورت میں پریشان ہو کر دوسروں کی طرف دست سوال دراز کرتے ہیں اور ان کا علم و دانش اسلامی

معاشرے کو پیش آنے والے مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہوتا ہے وہ ہر گز اس کا منصب اور لوگوں کی رہبری و قیادت کی باغ ڈور نہیں سنبھال سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ امام کو دین اللہ کا سب سے عظیم عالم ہونا چاہئے تاکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کی وجہ سے پیدا ہونے والے خلاء کو فوراً پر کر سکے اور صحیح اور ہر قسم کے انحرافات سے پاک اسلام کی راہ کو ثبات و دوام بخش سکے۔

۳۔ شجاعت: امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی معاشرے میں شجاع ترین انسان ہو، کیونکہ شجاعت کے بغیر، رہبری و قیادت ممکن نہیں ہے۔ یہ شجاعت سخت اور ناگوار حادث جابری، سرکشوں ظالموں، اور اسلامی مملکت کے داخلی و خارجی دشمنوں سے مقابلہ کے لئے ضروری ہے۔

۴۔ زہد و تقویٰ: ہم بخوبی جانتے ہیں کہ دنیا کی ظاہری شان و شوکت اور زرق و برق میں گرفتار ہوئے لوگ جلد دھوکہ کھاتے ہیں اور ان کے لئے حق کی راہ سے مخفف ہونے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ ان دنیا پرستوں کو کبھی لاٹ کے ذریعہ اور کبھی دھمکیوں سے اپنے اصلی راستے سے مخفف کیا جاتا ہے۔ امام کو اس دنیا کی ظاہری نعمتوں کے مقابلہ میں ”ایسر“ ہونے کے بجائے ”امیر“ (بے نیاز) ہونا چاہئے۔

اماں کو اس مادی دنیا کی ہر قید و بند، یعنی، نفسانی خواہشات، مقام و منزلت، مال و دولت اور جاہ و حشم کی قیود سے آزاد و بے نیاز ہونا چاہئے تاکہ فریب، اثر و سون خ اور سازش کے دام میں پھنسا کر اسے شکست نہ دی جاسکے۔

۵۔ پرکشش اخلاق: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید میں سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں ارشاد ہوا ہے: (فَبِمَار حَمْةٍ مِّنَ الْمُلْكِ لَهُمْ وَلَوْكُنْتُ قَطَا غَلِيلًا لِّقَلْبِ لَأَنْفَضُوا مِنْ حُولِكَ) (سورہ آل عمران، ۱۵۹)

”پیغمبر! یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بد مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے“

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام ہی نہیں بلکہ معاشرے کے ہر رہبر و پیشوائے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی پرکشش اور نیک اخلاق کا مالک ہوتا کہ وہ مقناتیں کے مانند لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

بیشک ہر قسم کی تندروی اور بد اخلاقی، جو لوگوں میں نفرت پیدا ہونے کا سبب ہوتی ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام کے لئے بہت بداعیب شمار ہوتی ہے وہ ایسے عیوب سے پاک و منزہ ہوتے ہیں، ورنہ (امام) کے بہت سے وجودی فلسفے بے کار ہو کر رہ جائیں گے۔

یہ اہم ترین شرائط ہیں، جو عظیم علماء نے امام کے لئے بیان کئے ہیں۔

البته مذکورہ پانچ صفات کے علاوہ بھی امام کے لئے کچھ مزید صفات اور شرائط کا ہونا ضروری ہے، لیکن ان میں سے اہم ترین صفات یہی ہیں جن کا ذکر ہم نے کیا ہے۔

## غور کچھ اور جواب دیجئے

- ۱۔ منصب امامت کس دلیل سے انسان کے لئے ایک بلند ترین منصب ہے؟
- ۲۔ کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر اولوی العزم انبیاء علیہم السلام بھی امامت کے منصب پر فائز تھے؟
- ۳۔ اگرام مخصوص نہ ہو تو کون سی مشکل پیش آسکتی ہے؟
- ۴۔ امام میں بھرپور علم کا ہونا کیوں ضروری ہے؟
- ۵۔ کس دلیل کی بناء پر امام کو سب سے شجاع، با تقوی، زاہد اور اخلاقی لحاظ سے پر کشش ہونا چاہئے۔

## چوتھا سبق

امام کا تعین کس کے ذمہ ہے؟

مسلمانوں کے ایک گروہ (ابن سنت) کا یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی حالت میں رحلت فرمائی کہ آپ نے اپنے بعد کسی کو جانشین کے طور پر مقرر و معین نہیں فرمایا تھا۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ ذمہ داری خود مسلمانوں کی ہے کہ اپنے لئے رہبر اور پیشواؤ کو منتخب کریں اور اس کام کو ”اجماع مسلمین“ کے طریقہ سے انجام دیں جو دلائل شرعی میں سے ایک دلیل ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد یہ کام انجام پایا اور سب سے پہلے خلیفہ اول امت کے اجماع کے ذریعہ خلافت کے عہدے پر منتخب کئے گئے۔ جبکہ پہلے خلیفہ نے (اجماع امت کے بجائے) خود ذاتی طور پر (وصیت کے ذریعہ) دوسرے خلیفہ کو مقرر کیا۔

اس کے بعد دوسرے خلیفہ نے چھ افراد پر مشتمل ایک شوریٰ تشکیل دی تاکہ یہی لوگ ان کے بعد ان کے جانشین کو منتخب کریں۔

اس شوریٰ کے اراکین: حضرت علیؓ، عثمان، عبد الرحمن بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد بن ادبلی و قاص تھے۔

اس شوریٰ نے تین اراکین کی اکثریت سے، یعنی سعد بن ابی و قاص، عبد الرحمن بن عوف اور طلحہ کی رائے سے عثمان کو منتخب کیا۔ دوسرے خلیفہ نے صراحةً کی تھی کہ شوریٰ کے اراکین کی رائے تین تین افراد پر برابر تقسیم ہو جانے کی صورت میں جس طرف عبد الرحمن بن عوف (عثمان کے بھنوئی کی رائے ہو) وہی خلیفہ منتخب کیا جائے!

عثمان کی خلافت کے آخری دنوں میں لوگوں نے مختلف دلائل کی بنا پر ان کے خلاف بغاوت کی اور اس سے پہلے کہ وہ ذاتی طور پر یا شوریٰ کے ذریعہ اپنا جانشین مقرر کرتے، انھیں قتل کر دیا۔

اس وقت عام مسلمانوں نے حضرت علی علیہ السلام کی طرف رخ کیا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کی حیثیت سے آپؐ کی بیعت کی۔ صرف شام کے گورنر معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت سے انکار کیا، کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ حضرت علیؓ سے موجودہ عہدے پر باقی نہیں رکھیں گے۔

معاویہ نے صرف حضرت علی علیہ السلام کی بیعت ہی نہیں کی بلکہ آپؐ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا اور اس طرح تاریخ اسلام میں ناگوار، مرگ اور اور مخدوش حادث کا دور شروع ہوا جس کے نتیجے میں بے گناہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کا خون بھہ گیا۔

یہاں پر علمی اور تاریخی بحثوں کے واضح ہونے کے لحاظ سے بہت سے سوالات ابھرتے ہیں، ہم ان میں سے چند سوالات پر بحث کر رہے ہیں:  
۱۔ کیا امامت کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین منتخب کرنے کا حق ہے؟

اس سوال کا جواب مشکل اور یقیدہ نہیں ہے۔ اگر ہم امامت کو اسلامی معاشرہ کی ظاہری حکمرانی جان لیں تو ایسے حاکم کو لوگوں کی رائے سے منتخب کرنا راجح ہے۔

لیکن اگر ہم امامت کو اس معنی میں لیں، جس کی وضاحت ہم پہلے قرآن مجید کی روشنی میں کر چکے ہیں، تو کسی شک و شبہ کے بغیر، خداوند متعال یا وحی الی سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی شخص امام اور خلیفہ کو معین نہیں کر سکتا ہے۔

کیونکہ اس تفسیر کے مطابق امامت کی شرط اسلام کے تمام اصول و فروع میں بھرپور علم رکھنا ہے ایسا علم جس کا سرچشمہ علم الہی اور علم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتا کہ وہ شریعت اسلام کی حفاظت کر سکے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ امام معصوم ہونا چاہئے، یعنی اسے خدا کی طرف سے ہر خطاؤ گناہ سے پاک و منزہ ہونے کی ضمانت حاصل ہوتا کہ معاشرے کی معنوی و مادی، ظاہری و باطنی رہبری و قیادت کی ذمہ داری سنبھال سکے۔

اس کے علاوہ امام یا خلیفہ کو اس منصب کے لئے ضروری زہد و تقویٰ، پر ہیزگاری اور شجاعت کا حامل بھی ہونا چاہئے۔

یہ بات یقینی ہے کہ ان شرائط کی تضیییں خدا اور پیغمبر کے علاوہ کسی اور کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ وہی (خدا ہی) یہ جانتا ہے کہ کس شخص کی روح عصمت کے نور سے منور ہے اور وہی جانتا ہے کہ منصب امامت کے لئے ضروری علم، تقویٰ، پر ہیزگاری، شجاعت و شہامت کس شخص میں موجود ہے۔

جن لوگوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ اور امام کا تعین لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا ہے، انہوں نے حقیقت میں امامت کے قرآنی

مفہوم میں تبدیلی ایجاد کر کے امامت کو عام حکمرانی اور دنیوی امور میں لوگوں کی رہبری تک محدود کر کے رکھ دیا ہے ورنہ جامع اور کامل معنی میں امامت کے شرائط پر ورد گار عالم کے ذریعہ ہی قابل تشخیص ہیں اور وہی ان صفات کے بارے میں مکمل علم و آگاہی رکھتا ہے۔

امام کا انتخاب بھی بالکل اسی طرح پیغمبر کا انتخاب کیا جاتا ہے جس طرح پیغمبر کا انتخاب لوگوں کی رائے سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ ضروری ہے کہ پیغمبر کا انتخاب خداوند متعال کی طرف سے ہو اور محبوثات کے ذریعہ اس کی پیچان کروائی جائے اس لئے کہ پیغمبر میں پائی جانے والی ضروری صفات کی تشخیص بھی صرف خداوند متعال ہی کر سکتا ہے۔

۲۔ کیا پیغمبر نے اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا ہے؟

بیشک دین اسلام ایک ”علمی“ اور ”لائفی“ دین ہے اور قرآن مجید کی واضح آیات کے مطابق یہ دین کسی خاص زمان و مکان سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے زمانہ تک یہ الٰہی اور آسمانی دین جزیرہ عرب سے باہر نہیں پھیلا تھا۔ دوسری طرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے تیرہ سال مکہ میں شرک و بت پرستی سے مبارزہ اور مقابلہ کرنے میں گزر گئے اور بھارت کے بعد، جو اسلام کے پھلنے اور پھولنے کا درد تھا، آپؐ کی زندگی کے باقی دس سال پیشتر دشمنوں کی طرف سے تھوپی گئی جگلوں اور غزوتوں میں صرف ہو گئے۔

اگرچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے مسائل کی تبلیغ اور تعلیم کے لئے دن رات انتہک کوشش کی اور اور نو عمر اسلام کا تمام جہات میں تعارف فرمایا، پھر بھی یقیناً اسلام کے بہت سے ایسے مسائل باقی تھے جن کی تفسیر و تشریح کے لئے مزید وقت درکار تھا، اس لئے ضروری تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی جیسا کوئی شخص آپؐ کے بعد اس سلسلہ میں ذمہ داری کو سنبھالے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ مستقبل کے حالات کی پیشگوئی کے پیش نظر مذہب کو دوام بخشنے کے مقدمات کو فراہم کرنا ان اہم امور میں سے ہے کہ ہر رہبر اور قائد کو اس کی فکر ہوتی ہے اور ہر گزار بات کے لئے آمادہ نہیں ہوتا ہے کہ اس بیانیادی مسئلہ کو فراموش کر دے۔

اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض اوقات انسانی زندگی کے معمولی اور سادہ مسائل کے بارے میں بھی احکام بیان فرمائے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ آپؐ نے مسلمانوں کی خلافت، زعامت اور امامت جیسے اہم مسئلہ کے بارے میں کوئی دستور معین نہیں فرمایا ہو گا؟!

ذکر کورہ تین نکات کا مجموعہ اس بات پر واضح دلیل ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے جانشین مقرر کرنے کا قطعاً اقدام فرمایا ہے۔ انشا اللہ ہم بعد میں اس سلسلہ میں قطعی اور مسلم الشبوت روایتوں کے چند نمونے بھی پیش کریں گے تاکہ یہ منطقی حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو جائے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر گز اپنی زندگی کے دوران اس اہم اور حیاتی مسئلہ سے غافل نہیں رہے ہیں، اگرچہ خاص سیاسی و جوہات کی بناء پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد لوگوں کے ذہنوں میں یہ تصور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا ہے۔

کیا یہ بات قابل یقین ہے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوتوں (جیسے غزوہ توبک) کے دوران صرف چند نوں کے لئے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے تو ضرور اپنی جگہ پر کسی کو جانشین مقرر فرماتے تھے اور اپنی جگہ خالی نہیں رکھتے تھے، لیکن اپنی رحلت کے بعد کی کوئی پرداز کے بغیر کسی قسم کا اقدام نہ فرمائیں، اور امامت کو اختلافات اور سرگردانی کے طوفان میں اپنے حال پر چھوڑ دیں اور ہر ایک رہبر کے ذریعہ اسلام کے دوام کی

نهانت فرائم نہ فرمائیں؟!

اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا جانشین مقرر نہ فرماتے تو یقیناً عمر اسلام کے لئے بڑے خطرات لاحق ہوتے۔ عقل اور منطق اس بات کی ہر گز اجازت نہیں دیتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کام انعام دیں جس سے اسلام کو خطرات لاحق ہوں۔ جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کام امت کے ذمہ چھوڑ دیا ہے، وہاپنے اس نظریہ کی تائید میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کم از کم ایک دلیل تو پیش کریں، جس سے ثابت ہو جائے کہ پیغمبر اسلام نے اس نظریہ کی تاکید فرمائی ہے!، جبکہ ان کے پاس اس سلسلہ میں کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے۔

### ۳۔ اجماع اور شوریٰ

فرض کریں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (اپنا جانشین مقرر کرنے کے) اس نہایت اہم مسئلہ کو نظر انداز کیا ہوا اور خود مسلمانوں پر اس (غیفہ) کے انتخاب کرنے کی ذمہ داری ہو لیکن ہم جانتے ہیں کہ ”اجماع“ سے مراد تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور پہلے خلیفہ کی غافلت کے بارے میں ہر گز ایسا اتفاق یا اجماع حاصل نہیں ہوا ہے۔ صرف مدینہ میں موجود اصحاب میں سے چند صحابیوں نے اس بات کا فیصلہ کیا، جبکہ تمام اسلامی شہروں کے لوگوں نے اس فیصلہ میں بالکل شرکت نہیں کی، بلکہ خود مدینہ میں موجود حضرت علیؓ اور بنی ہاشم کے بہت بڑے گروہ نے اس انتخاب میں کسی قسم کی شرکت نہیں کی، اس لئے یہ اجماع قطعاً قابل قبول نہیں ہے۔

پھر اگر یہ طریقہ صحیح تھا، تو پہلے خلیفہ نے اپنا جانشین مقرر کرنے کے سلسلہ میں کیوں اس پر عمل نہیں کیا؟ انہوں نے کیوں ذاتی طور پر اپنا جانشین نامزد کیا؟ اگر ایک شخص کی طرف سے جانشین کو مقرر کرنا کافی ہوتا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کام کے لئے سب سے افضل واولیٰ تھے۔ اگر لوگوں کی طرف سے بعد میں کی جانے والی بیعت اس مشکل کو حل کر سکتی ہے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہی بیعت بہر صورت میں مسئلہ کو حل کر سکتی ہے۔

اس کے علاوہ تیری مشکل ”خلیفہ سوم“ کے بارے میں پیش آتی ہے، کہ دوسرے خلیفہ نے کیوں پہلے خلیفہ کے منتخب ہونے کے طریقہ کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور جس طریقہ سے خود بر سراقتدار آئے تھے، اس کو بھی توڑ دیا یعنی نہ ”اجماع“ پر عمل کیا اور نہ ذاتی طور پر کسی کو نامزد کیا بلکہ اس کام کے لئے ایک تیرا طریقہ ایجاد کر کے ایک مدد و شوریٰ کو اس کام کی ماموریت دے دی۔

اصولی طور پر اگر شوریٰ صحیح ہے تو یہ شوریٰ کیوں صرف چھ افراد تک محدود ہو؟ اور چھ ارکان میں سے صرف تین ہی کی رائے کافی ہو؟ یہ وہ سوالات ہیں جو تاریخ اسلام کے ہر محقق کو پیش آتے ہیں اور ان سوالات کا جواب نہ ملتا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امام اور خلیفہ کے انتخاب کے مذکورہ طریقہ صحیح نہیں ہیں۔

### ۴۔ علی علیہ السلام سب سے لائق و افضل تھے۔

اگر ہم فرض کریں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بھی شخص کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا، اور یہ بھی فرض کر لیں کہ یہ کام لوگوں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ خلیفہ اور امام کو منتخب کرنے کے وقت ایک ایسے شخص کو نظر انداز کر دیا جائے جو علم، تقویٰ، پرہیزگاری شجاعت اور دوسرے امتیازات و خصوصیات کے لحاظ سے سب سے افضل ہو اور اس کے بجائے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو اس سے نہایت کمتر ہو؟!

علماء اسلام کی ایک بڑی تعداد، حتیٰ کہ اہل سنت علماء نے واضح طور پر لکھا ہے کہ اسلامی مسائل سے آگاہی اور علم رکھنے کے حوالے سے حضرت علیؓ سب سے افضل تھے۔ خود حضرتؓ سے باقی ماندہ روایات اور آثار اس حقیقت کے روشن ثبوت ہیں۔ تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ حضرت علیؓ تمام علمی مشکلات کو حل کرنے میں امت کے پناہ گاہ تھے، یہاں تک کہ اگر کبھی خلفاء کو بھی کوئی یچھیدہ یا مشکل مسئلہ پیش آتا تھا، وہ حضرتؓ کی طرف رجوع کرتے تھے اور آپؓ سے مدد طلب کرتے تھے۔

حضرت علیؓ شیعات، علم، تقویٰ، پرہیز گاری اور دوسری صفات کے لحاظ سے سب سے افضل تھے اس لئے اس فرض کی بناء پر کہ لوگوں کو امام و خلیفہ چننے کا حق تھا، پھر بھی علیؓ اس منصب کے لئے سب سے زیادہ لاائق اور شائستہ تھے۔ (البتہ اس بحث سے متعلق کافی اسناد موجود ہیں، جن کا ذکر اختصار کے پیش نظر یہاں پر ممکن نہیں ہے)۔

#### غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ یا امام کو لوگ کیوں منتخب نہیں کر سکتے؟
- ۲۔ کیا عقل و منطق یہ بات مانتی ہے کہ پیغمبرؐ نے اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا؟
- ۳۔ پہلے تین خلفاء کا انتخاب کن طریقوں سے عمل میں آیا؟
- ۴۔ کیا پہلے تین خلفاء کے انتخاب کا طریقہ علمی اور اسلامی اصولوں کے مطابق تھا؟
- ۵۔ کن دلائل کی بناء پر علیؓ سب سے لاائق ہیں؟

## پانچواں سبق

قرآن اور امامت

عقلیم آسمانی کتاب قرآن مجید، دوسری تمام چیزوں کے مانند امامت کے مسئلہ میں بھی ہمارے لئے بہترین راہنماء ہے۔ قرآن مجید نے مسئلہ امامت پر مختلف جهات سے بحث کی ہے۔

۱۔ قرآن مجید ”امامت“ کو خدا کی جانب سے جانتا ہے:

جیسا کہ ہم نے گزشتہ بحثوں میں حضرت ابراہیمؑ بت شکن کی داستانوں میں پڑھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کو نبوت اور رسالت پر فائز ہونے اور مختلف امتحانات میں کامیاب ہونے کے بعد امامت کے عہدہ پر فرار دیا ہے۔ اور سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۲ میں ارشاد فرمایا ہے: (وَإِذَا تَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبَّهُ بَكْلِيلٍ فَأَنْهَنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلٌ لِلنَّاسِ إِمَامًا)

”اور اس وقت کو یاد کرو جب خدا نے چند کلمات کے ذریعہ ابراہیمؑ کا امتحان لیا اور انہوں نے پورا کر دیا تو اس نے کہا تم کو لوگوں کا امام بنار ہے ہیں۔“

قرآن مجید کی مختلف آیات اور تاریخی قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بالکے بت پرستوں سے مبارزہ کرنے، شام کی طرف ہجرت کرنے اور خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو قربان گاہ میں لے جانے کے بعد امامت کے منصب پر فائز ہوئے ہیں۔

جب نبوت و رسالت کا عہدہ خدا کی طرف سے معین ہونا ضروری ہے تو مخلوق کی ہمہ جہت امامت و رہبری کا مرتبہ بطریق اولی خدا کی طرف سے معین ہو ناضروری ہے، کیونکہ امامت کا مرتبہ رہبری کے تکامل کی معراج ہے۔ اس لئے یہ کوئی ایسی معمولی چیز نہیں ہے جسے لوگ انتخاب کریں۔

پھر قرآن مجید خود مذکورہ آیت میں فرماتا ہے:

(إِنِّي جَاعِلٌ لِلنَّاسِ إِمَامًا )

”میں تم کو امام و پیشو اقرار دیںے والا ہوں۔“

اسی طرح سورہ کانیاء کی آیت نمبر ۳۷ میں بھی بعض باعظمت انبیاء جیسے: حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوٹؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَجَعَلْنَا هُمْ أَئِمَّةً يَهْدِوْنَ بِأَمْرِنَا )

”اور ہم نے ان سب کو پیشو اقرار دیا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔“

اس فہم کی تعبیریں قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الٰہی منصب خداوند متعال کے توسط سے ہی معین ہونا

چاہئے۔

اس کے علاوہ ہم حضرت ابراھیمؑ کی امامت سے متعلق مذکورہ آیت کے آخری حصہ میں پڑھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے فرزندوں اور آنے والی نسل کے لئے اس منصب کی درخواست کی تو اللہ کی طرف سے یہ جواب ملا:

(لابیال عحمدی الظالمین )

”میرا عہدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا“

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپؐ کی دعا قبول ہوئی، لیکن آپؐ کے

فرزندوں میں سے جو ظلم کے مرتكب ہونے والے ہیں وہ ہرگز اس مرتبہ پر فائز نہیں ہوں گے۔

قابل ذکر بات ہے کہ لغوی اور قرآن مجید کی منطق کے اعتبار سے ”ظالم“ کے وسیع معنی ہیں اور اس میں تمام گناہ ممن جملہ ان کے آشکار و مخفی شرک اور اپنے اوپر اور دوسروں پر ہر قسم کا ظلم شامل ہے۔ چونکہ خداوند متعال کے علاوہ کوئی اس امر سے مکمل طور پر آگاہ نہیں ہے، کیونکہ صرف خدا ہی لوگوں کی نیتوں اور باطن سے آگاہ ہے، اس لئے واضح ہوتا ہے کہ اس مرتبہ و منصب کا تعین صرف خداوند متعال کے ہاتھ میں ہے۔

۲- آیہ تبلیغ

سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۷۱ میں یوں ارشاد ہوا ہے:

(لَيَأْتِهَا الرَّسُولُ بِلِّغَةِ الْأَنْذِيلِ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا لَبَّعْتَ رِسَالَتَنَا وَاللَّهُ يَعْصِمُ مَنِ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لِيَحِدُّ الْقَوْمَ الْكُفَّارِينَ )

”اے پیغمبر! آپ اس حکم کو پہنچا دیں جو آپؐ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپؐ نے یہ نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا کہ اللہ کافروں کی بدایت نہیں کرتا ہے۔“

اس آیہ شریفہ کے لمحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوش مبارک پر ایک سنگین مأموریت ڈالی گئی ہے اور اس سلسلہ میں ہر طرف کچھ خاص قسم کی پریشانیاں پھیلی تھیں، یہ ایسا پیغام تھا کہ ممکن تھا لوگوں کے ایک گروہ کی طرف سے اس کی مخالفت کی جاتی، اس لئے آیہ شریفہ تاکید کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس پر عمل کرنے کا حکم دیتی ہے اور ممکنہ خطرات اور پریشانیوں کے مقابلہ میں آپؐ کو خاطر خواہ طمیناً دلاتی ہے۔

یقیناً یہ اہم مسئلہ توحید، شرک یا یہود و مذاہقین جیسے دشمنوں سے جہاد کرنے سے مربوط نہیں تھا، کیونکہ اس زمانہ (سورہ مائدہ نازل ہونے) تک یہ مسئلہ مکمل طور پر حل ہو چکا تھا۔

اسلام کے دوسرے احکام پہنچانے کے سلسلہ میں بھی اس قسم کی پریشانی اور اہمیت نہیں تھی، کیونکہ مذکورہ آیت کے مطابق بظاہر یہ حکم رسالت کے ہم وزن اور ہم پلہ تھا کہ اگر یہ حکم نہ پہنچایا جاتا تو رسالت کا حق ادا نہیں ہوتا۔ کیا یہ مسئلہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی جانتیں اور خلافت کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے؟ خاص کر جب کہ یہ آیت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کے آخری دنوں میں نازل ہوئی ہے اور یہ خلافت کے مسئلہ کے ساتھ تناسب بھی رکھتا ہے، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت و نبوت کی بقا کا وسیلہ ہے۔

اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں کی ایک بڑی تعداد، من جملہ زید بن ار تم، ابو سعید خدری، ابن عباس، جابر بن عبد اللہ النصاری، ابو ہریرہ، حذیفہ اور ابن مسعود سے اس سلسلہ میں کثیر تعداد میں روایتیں نقل ہوئی ہیں اور ان میں سے بعض روایتیں گیارہ وسطوں سے ہم تک پہنچی ہیں اور اہل سنت علماء، مفسرین، محدثین اور مورخین نے بھی انھیں نقل کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ مذکورہ آیت حضرت علیؑ اور غدیر کے واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (۱)

ان شاء اللہ ہم ”غدیر“ کی داستان کو ”روایات و سنت“ کے عنوان سے آئندہ بحث میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ لیکن یہاں پر ہم اسی یادداہی پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ آیت اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرض تھا کہ اپنی زندگی کے آخری حج سے لوٹتے وقت حضرت علیؑ کو باضابطہ طور پر اپنا جانتشیں معین کریں اور تمام مسلمانوں کو ان کا تعارف کرائیں۔

۱۔ مزید تفصیلات کے لئے کتاب ”احقاق الحق“، ”الغدیر“، ”المراجعتات“ اور ”دلائل الصدق“ کا مطالعہ کریں۔

۲۔ آیہ اولی الامر

سورہ نساء کی آیت نمبر ۵۹ میں ارشاد ہوا ہے:

(يَا يَحْيَا الَّذِينَ أَمْنَوْا إِلَيْهِمُ الْأَطْيَابُ وَإِلَوْا الْأَمْرَ مُنْكِمَ (...)

”آیمان وَالوَالِهِ! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمھیں میں سے ہیں“...  
یہاں پر اولو الامر کی اطاعت کسی قید و شرط کے بغیر خدا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم  
کی اطاعت کے ہمراہ بیان ہوئی ہے۔

کیا ”اولو الامر“ سے مراد ہر زمان و مکان کے حکام اور فرمادہ ایں؟ مثلاً گیا ہمارے زمانے میں ہر ملک کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے حکام اور فرمادہ ایں کی اطاعت کریں؟ (جیسا کہ اہل سنت کے بعض مفسرین نے بیان کیا ہے)

یہ بات عقل و منطق کی کسوٹی پر ہر گز نہیں اترتی ہے، کیونکہ اکثر حکمران مختلف زمانوں اور عصروں میں محرف، گناہ کار، دوسرا ملکوں کے ایجنس اور ظالم ہوئے ہیں۔ کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ان حکمرانوں کی پیروی و اطاعت کی جانی چاہئے جن کا حکم اسلامی احکام کے خلاف نہ ہو؟ یہ بھی آیت کے مطلق ہونے کے خلاف ہے۔

کیا اس سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخصوص اصحاب ہیں؟ یہ اختال بھی اس آیت کے وسیع مفہوم (جوہر دور اور زمانے کے لئے ہے) کے خلاف ہے۔

اس لئے ہمارے لئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد مخصوص پیشوں ہے جوہر دور اور زمانے میں موجود ہوتا ہے اور اس کی اطاعت کسی قید و شرط کے بغیر واجب ہوتی ہے اور اس کا حکم، خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مانند واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں اسلامی منابع و مأخذ میں موجود متعدد احادیث میں ”اولو الامر“ کی حضرت علیؑ اور ائمہ معصومینؑ سے کی گئی تقطیق بھی اس حقیقت کی گواہ

ہے۔ (۱)

۱۔ مزید تفصیلات کے لئے تفسیر نمونہ ج ۳: ص ۲۳۵ کا مطالعہ کریں۔

۲۔ آیہ ولایت

سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۵۵ میں ارشاد ہوا ہے:

(إِنَّمَا وَلِيْكُمُ الْمُحَارَوْلِ اللَّهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ يَقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيَؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاجِعُونَ)

”ایمان والویس تمھارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ صاحبان ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔“

عربی لغت میں لفظ ”إنما“ انحصار کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس بات کے پیش نظر قرآن مجید نے مسلمانوں کی قیادت اور ولایت و سرپرستی کو صرف تین اشخاص میں مختص فرمایا ہے: ”خدا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔“

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ”ولایت“ سے مراد مسلمانوں کی آپس دوستی نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کی عام دوستی کے لئے قید و شرط کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمام مسلمان آپس میں دوست اور بھائی بھائی ہیں اگرچہ رکوع کی حالت میں کوئی زکوٰۃ بھی نہ دے۔ اس لئے یہاں پر ”ولایت“ وہی مادی و معنوی رہبری اور سرپرستی کے معنی میں ہے، بالآخر جب کہ یہ ولایت، خدا کی ولایت اور پیغمبر کی ولایت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ مذکورہ آیت میں ذکر شدہ اوصاف ایک مخصوص شخص سے مربوط ہیں، جس نے رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دی ہے، ورنہ یہ کوئی ضروری امر نہیں ہے کہ انسان نماز کے رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دا کرے، حقیقت میں یہ ایک نشانہ ہی ہے نہ توصیف۔

ان تمام قرائیں سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیہ شریفہ حضرت علیؓ کی ایک مشہور داستان کی طرف ایک پر معنی اشارہ ہے کہ حضرت علیؓ نماز کے رکوع میں تھے، ایک حاجتمند نے مسجد نبوی میں مدد کی درخواست کی۔ کسی نے اس کا ثابت جواب نہیں دیا۔ حضرت علیؓ نے اسی حالت میں اپنے دامیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے اشارہ کیا۔ حاجتمند نزدیک آگیا۔ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں موجود گراں قیمت انگوٹھی کو ہاتا کر لے گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس واقعہ کا مشاہدہ فرمایا تو نماز کے بعد اپنے سر مبارک کو آسمان کی طرف بلند کر کے یوں دعا کی: پرو را! میرے بھائی موسیؑ نے تجھ سے درخواست کی کہ ان کی روح کو کشاوہ، کام کو آسان اور ان کی زبان کی لکنت کو دور فرمادے اور ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر اور مدگار بنادے... پرو را! میں محمد، تیر انتخی پیغمبر ہوں، میرے سینہ کو کشاوہ اور میرے کام مجھ پر آسان فرماء، میرے خاندان میں سے علیؓ کو میرا وزیر قرار دے تاکہ اس کی مدد سے میری کمر قوی اور مضبوط ہو جائے۔ ...

ابھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعائیں ہوئی تھی کہ مذکورہ بالا آیہ شریفہ کو لے کر جبراً میں نازل ہوئے۔

دچکپ بات یہ ہے کہ اہل سنت کے بہت سے عظیم مفسرین، مورخین اور محدثین نے اس آیہ شریفہ کی شان نزول کو حضرت علیؓ کے بارے میں نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ایک گروہ نے، جن کی تعداد سے زیادہ ہے، اس حدیث کو خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے برادرست نقل کیا ہے۔ (۱)

ولایت کے موضوع پر قرآن مجید میں بہت سی آیات ذکر ہوئی ہیں، ہم نے کتاب کے اختصار کے پیش نظر صرف مذکورہ چار آیتوں پر ہی اکتفا کیا۔

۱۔ مزید توضیح کے لئے قیمتی کتاب ”الراجعت“ کا مطالعہ فرمائیے، جس کا اردو ترجمہ ”دین حق“ کے نام سے ہو چکا ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ قرآن کی روشنی میں امام کو منتخب و معین کرنے کس کے ذمہ ہے؟

۲۔ آیہ تبلیغ کن حالات میں نازل ہوئی ہے اور اس کا مفہوم کیا ہے؟

۳۔ کن شخصیات کی بلا قید و شرط اطاعت کرنا عقل کے مطابق ہے؟

۴۔ آیہ ”إِنَّمَا أَكِيمُ السُّلْطَانَ..“ کن دلائل کی بناء پر رہبری اور امامت کی طرف اشارہ ہے۔

۵۔ مسئلہ ولایت کے بارے میں موجود قرآن مجید کی تمام آیات سے کن مسائل کے سلسلہ میں استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

## چھٹا سبق

امامت، سنت نبی کی روشنی میں

اسلامی احادیث سے مربوط کتابوں، بالخصوص اہل سنت بھائیوں کی طرف سے تالیف کی گئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے دوران انسان پنجمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی احادیث کی ایک کشیر تعداد سے روبرو ہوتا ہے جو واضح طور پر حضرت علیؓ کی امامت و خلافت کو ثابت کرتی ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اتنی احادیث موجود ہونے کے باوجود اس مسئلہ کے بارے میں کسی قسم کا خشک و شہید ہاتھ نہیں رہ جاتا تو پھر ایک گروہ اہل بیتؓ کی راہ سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ کیسے اختیار کر لیتا ہے؟

یہ احادیث، جن میں سے بعض کے اسناد سینکڑوں تک ہیں (جیسے حدیث غدیر) اور بعض کے اسناد سیوں تک اور دسیوں مشہور اسلامی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، ایسی واضح اور روشن ہیں کہ اگر ہم تمام گفتگوؤں کو نظر انداز کر دیں اور کسی کی تقلید کرنا چھوڑ دیں، توہ مسئلہ ہمارے لئے ایسا واضح ہو جائے گا کہ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

ان احادیث کے مخزن سے ہم یہاں پر چند مشہور احادیث کو نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اس موضوع پر پیشتر اور گھرے مطالعہ کا شوق رکھنے والوں کے لئے ہم بعض منابع (کتابوں) کی نشاندہی کرتے ہیں تاکہ ان سی استفادہ کریں۔ (۱)

### ۱- حدیث غدیر

مورخین اسلام کی ایک بہت بڑی تعداد نے لکھا ہے کہ پنجمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کے آخری سال حج بجالائے۔ فرانصہ حج کو بجالانے کے بعد جبکہ حجاز کے مختلف علاقوں سے حج کے لئے آئے ہوئے آپؐ کے نئے اور پرانے صحابیوں اور اسلام کے عاشقوں کی ایک بڑی تعداد آپؐ کے ساتھ تھی۔ مکہ سے واپسی پر یہ عظیم اجتماع، مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ”حجف“ نامی ایک جگہ سے گزرتے ہوئے ”غدیر خم“ کے نام پر ایک خشک اور گرم بیابان میں پہنچ گیا۔ درحقیقت یہ ایک چوراہا تھا۔ جہاں پر حجاز کے تمام لوگوں کے راستے جدا ہوتے تھے۔

یہاں پر حجاز کے مختلف علاقوں کی طرف جانے والے مسلمانوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے پنجمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو رکنے کا حکم دیا۔ جو آگے بڑھتے تھے انھیں واپس آنے کا حکم دیا اور پیچھے سے آنے والوں کا انتظار کیا گیا، اس طرح سب ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ہواں تھائی گرم اور دھوپ نہایت جھلسادینے والی تھی۔ بیابان میں دور دوستک کہیں کوئی سائبان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مسلمانوں نے پنجمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امامت میں ظہر کی نماز پڑھی۔ جب ان سب نے نماز کے بعد اپنے نیمیوں کی طرف جانا چاہا تو پنجمبر اسلام نے حکم دیا کہ سب لوگ ٹھہر جائیں اور ایک مفصل

- پیشتر وضاحت کے لئے کتاب "الراجعت" ، "الغدیر" اور "نوید امن و امان" کی طرف رجوع کریں۔  
خطبہ کے ضمن میں ایک اہم الہی پیغام کو سننے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

اوٹوں کے پالانوں کا ایک منبر بنایا گیا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر تشریف لے گئے آپ نے حمد و شکر اللہ کے بعد لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

میں خدا کی دعوت کو لبیک کہتے ہوئے جلدی ہی تمہارے درمیان سے رخصت ہونے والا ہوں۔ میں ذمہ دار ہوں اور تم لوگ بھی ذمہ دار ہو۔ تم لوگ میرے بارے میں کس طرح کی شہادت دیتے ہو؟  
لوگوں نے بلند آواز سے کہا:

"نَشَدَ أَنْكَ قَدْ بُلْغَتْ وَنَصَّحْتْ وَجَهَدْتْ فِي جَزَّاكَ السَّلَامِيرَا"

"هم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے رسالت کی ذمہ داریاں نہیں اور ہماری بھلائی کے لئے ہماری نصیحت کی اور ہماری ہدایت میں نہایت کوشش کی، خداوند متعال آپ کو جزائے خیر دے۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت، میری رسالت اور قیامت کی حقیقت اور اس دن مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کی شہادت دیتے ہو؟

جواب میں سب نے یک زبان ہو کر کہا: جی ہاں، ہم گواہی دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: خداوند! گواہ رہنا...  
آپ نے دوبارہ فرمایا: اے لوگوں! کیا میری آواز سن رہے ہو؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔

اس کے بعد پورے بیابان میں چاروں طرف خاموشی چھائی اور ہوا کی سنسنی ہٹ کی آواز کے علاوہ کوئی دوسرا آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

پیغمبر اسلام نے فرمایا: اب بتاؤ کہ ان دو گرانقدر چیزوں کے ساتھ تم لوگ کیسا سلوک کرو گے جو میں تمہارے درمیان یادگار کے طور پر چھوڑے جا رہا ہوں؟

مجموع میں سے کسی نے بلند آواز سے سوال کیا: کون سی دو گرانقدر چیزیں، یا رسول اللہ؟!  
پیغمبر نے فرمایا: پہلی چیز "تقلیل اکبر" یعنی کتاب الہی "قرآن مجید" ہے۔ اس کے دامن کوہ گزنه چھوڑناتا کہ گمراہ نہ ہو جاؤ۔ اور دوسری گرانقدر یادگار چیز میرے اہل بیت ہیں۔ خداوند طیف و خبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دو چیزوں ہر گز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو گئیں یہاں تک کہ بہشت میں مجھ سے مل جائیں، ان دونوں سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور ان سے پیچھے بھی نہ رہنا، کیونکہ اس صورت میں بھی ہلاک ہو جاؤ گے۔

اس دوران اچانک آپ نے اپنی نظریں ادھر ادھر دوڑائیں، جیسے کہ آپ کو کسی کی تلاوہ تھی۔ جوں ہی آپ کی نظر حضرت علی پر پڑی، آپ جھک گئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغلوں کی سفیدی و کھائی دے رہی تھی۔ سب لوگوں نے حضرت علی کو دیکھا اور انھیں پہچان لیا۔

اس موقع پر آنحضرت نے اور زیادہ بلند آواز کے ساتھ فرمایا:  
ایہا الناس! من اولی النّاس بالمومنین من انفسِمُن؟

لوگو! لوگوں میں سے کون شخص مومنین پر خودا ان سے بھی زیادہ سزاوارا ہے؟

سب نے جواب میں کہا: خدا اور سماں کا رسول بہتر جانتا ہے۔

پیغمبر نے فرمایا:

”خداوند متعال میر امولا اور ہبہ ہے، اور میں مومنین کا مولا اور ہبہ ہوں اور ان کی نسبت خودا ان سے بھی زیادہ حق رکھتا ہوں۔“

اس کے بعد فرمایا:

”فمن کنت مولاہ فلی مولاہ“

”جس جس کا میں مولا اور ہبہ ہوں، اس اس کے علی بھی مولا ہیں“

آنحضرت نے اس جملہ کو تین مرتبہ دہرا�ا، بعض روایات حدیث کے مطابق اس جملہ کو چار مرتبہ دہرا�ا، اس کے بعد اپنے سر کو آسمان کی طرف بلند کر کے

فرمایا:

”اللَّمَّا مِنْ وَالَّهُ وَعَادَ مِنْ عَادَهُ وَاحِبَّ مِنْ أَحَبَّهُ، وَلِغُضْنِ مِنْ أَبْغَضَهُ، وَالنَّصَرُ مِنْ نَصَرَهُ، وَالخَذْلُ مِنْ خَذْلَهُ، وَادَارَ الْحَقَّ مَعَ حِيثَ دَارَ“

”خداوند! اس کے دوستوں کو دوست رکھ اور سے دشمنوں سے دشمن رکھ، جو شخص اسے محظوظ رکھے اسے محظوظ رکھ اور اس شخص سے بغضہ رکھ جس کے دل میں اس کا بغضہ ہو، اس کے دوستوں کی یادی فرماؤ اس کا ساتھ چھوڑنے والوں کو محروم فرماء، حق کو اس کے ساتھ پھیر جو جہود پھرے“

اس کے بعد فرمایا:

”تمام حاضرین اس خبر کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو اس وقت یہاں پر حاضر نہیں ہیں۔“

ابھی لوگ متفرق نہیں ہوئے تھے کہ جبراً میں وحی الہی لے کر نازل ہوئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے یہ شریفہ لے آئے: (اليوم اكملت لكم دينكم واتمتت عليكم نعمتي...) (سورہ مائدہ ۳۳)

”آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کر دیا ہے۔“ ...

اس موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”السَّلَّا كَبَرُ، السَّلَّا كَبَرُ، عَلَى إِكْمَالِ الدِّينِ وَإِتْمَامِ النَّعْمَةِ وَرَضِيَ الرَّبُّ بِرِسَالَتِي وَالوَلَايَةِ عَلَى مَنْ بَعْدِي۔“

”خدا کی بزرگی کا اعلان کرتا ہوں، خدا کی بزرگی کا اعلان کرتا ہوں، اس لئے کہ اس نے اپنے دین کو کامل اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کر دیا ہے اور میری رسالت اور میرے بعد علی کی ولایت سے راضی ہونے کا اعلان فرمایا ہے۔“

اس وقت لوگوں میں شور و غوغای پلند ہوا، لوگ حضرت علی کو اس مرتبہ کی مبارک باد دے رہے تھے، یہاں تک کہ ابو بکر اور عمر نے لوگوں کے اجتماع میں

علی سے مخاطب ہو کر یہ جملہ کہا:

”نَنْجِلَكَ يَا بَنَ ابِي طَالِبٍ اصْبَحْتَ وَامْسَيْتَ مُولَّاً وَمُولَّاً كُلَّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ“

”مبارک ہو آپ کو، مبارک ہو آپ کو، اے فرزند ابی طالب آپ میرے اور تمام مومنین و مومنات کے مولا اور ہبہ ہو گئے ہیں۔

ذکورہ بالاحدیث کو علمائے اسلام کی ایک بڑی تعداد نے مختلف عبارتوں میں، کہیں منفصل اور کہیں خلاصہ کے طور پر اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ یہ

حدیث متواتر احادیث میں سے ہے اور کوئی بھی شخص اس کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صادر ہونے پر شک و شبہ نہیں کر سکتا ہے، یہاں تک کہ مصنف و محقق ”علامہ امینی“ نے اپنی مشہور کتاب ”الغدیر“ میں اس حدیث کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک سو دس اصحاب اور تین سو ساتھ اسلامی علماء کی کتابوں سے نقل کیا ہے۔ یہ حدیث اہل سنت بھائیوں کی اکثر تفسیر و تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں درج ہے، یہاں تک کہ علمائے اسلام کی ایک بڑی تعداد نے اس حدیث کے سلسلہ میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ مرحوم علامہ امینی نے اس سلسلہ میں ایک گرانقدر اور بے نظیر مستقل کتاب لکھی ہے اور اس میں چھبیس ایسے علمائے اسلام کے نام درج کئے ہیں جنہوں نے ”حدیث غدیر“ کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

بعض اشخاص نے حدیث کی سند کو ناقابل انکار پاتے ہوئے اس کی امامت و خلافت پر دلالت کے بارے میں شک و شبہ ایجاد کرنے کی کوشش کی ہے، اور مولا کے معنی کو ”دost“ کے عنوان سے جھوٹی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے، جبکہ حدیث کے مضمون، زمان و مکان کے شرائط اور دوسرے قرائن پر غور کرنے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ”مولو“ کا مقصد، بمعنی مکمل رہبری و قیادت اور مسئلہ امامت و ولایت کے علاوہ کچھ نہیں ہے:

الف: آیہ تبلیغ، جس کا ہم نے گزشتہ سبق میں ذکر کیا، اس واقعہ سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اس میں موجود تند و سخت ابجہ اور قرائن اس بات کی بخوبی گواہی دیتے ہیں کہ یہ عام دوستی اور رفاقت کی بات نہیں ہے، کیونکہ یہ امر پریشان کن نہیں تھا اور اس کے لئے اتنی اہمیت اور تاکید کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح اس واقعہ کے بعد نازل ہونے والی آیہ ”امکال الدین“ اس امر کی گواہ ہے کہ یہ مسئلہ ایک غیر معمولی مسئلہ تھا اور رہبری و پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانتشی کے علاوہ کوئی اور مسئلہ نہیں تھا۔

ب۔ اس حدیث کا ان تمام مقدمات کے ساتھ اس تپتے ہوئے بیان میں ایک تفصیلی خطبہ کے بعد بیان کیا جانا اور اس حساس زمان و مکان میں لوگوں سے اقرار لینا یہ سب ہمارے دعویٰ کی مستحکم دلیل ہے۔

ج۔ مختلف گروں اور شخصیتوں کی طرف سے حضرت علیؓ کو مبارک باد دینے کے علاوہ اس سلسلہ میں اسی روز اور اس کے بعد کہنے گئے اشعار، اس حقیقت کے گویا ہیں کہ یہ مسئلہ علیؓ علیہ السلام کی امامت و ولایت کے بلند منصب پر منصوب ہونے سے مربوط تھا نہ کسی اور چیز سے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ داستان غدیر کو بیان کیجئے۔

۲۔ ”حدیث غدیر“ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کتنا سادے اور کتنا اسلامی کتابوں میں نقل ہوئی ہے؟

۳۔ ”حدیث غدیر“ میں ”مولو“ کیوں ”رہبر و امام“ کے معنی میں ہے اور دost کے معنی میں کیوں نہیں ہے؟

۴۔ غدیر کے واقعہ کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کے حق میں کون سی دعا کی؟

۵۔ ”غدیر“ اور ”جھٹھ“ کہاں پر ہیں؟

## ساتواں سبق

حدیث ”منزلت“ اور حدیث ”یوم الدار“

بہت سے عظیم شیعہ و سنی مفسرین نے حدیث ”منزلت“ کو سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۳۲ کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ اس آیہ شریفہ میں حضرت موسیؑ کے چالیس راتوں کے لئے کوہ طور پر جانے اور اپنی جگہ پر ہارون کو جانشین مقرر کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔  
حدیث یوں ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی گئی کہ مشرقی روم کے بادشاہ نے چجاز، مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے ایک بڑی فوج کو آمادہ کیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کو اپنے خاص انسانی اور حریت و استقلال کے نظام کے ساتھ اس علاقہ میں پہنچنے سے پہلے ہی، نابود کر دیا جائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں حضرت علیؓ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ عظیم لشکر کے ہمراہ توبک کی طرف روانہ ہو گئے (توبک جزیرہ عرب کے شمال میں مشرقی روم کی سلطنت کی سرحد پر واقع تھا)۔  
حضرت علیؓ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی: کیا مجھے بچوں اور عورتوں کے درمیان چھوڑ رہے ہیں؟ (اور اس بات کی اجازت نہیں دے رہے ہیں کہ آپکے ہمراہ میدان جہاد میں چل کر اس عظیم افتخار کو حاصل کروں؟)۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”الاتر خنی ان تکون منی بنزلہ مسحارون من موسیٰ اللہ لیس نبی بعدی؟“

”کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تمہاری مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کی موسیٰ سے تھی صرف یہ کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا؟“  
ذکورہ عبارت اہل سنت کی مشہور ترین حدیث کی کتابوں، یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں نقل ہوتی ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ صحیح بخاری میں  
پوری حدیث درج ہے اور صحیح مسلم میں ایک مرتبہ پوری حدیث اور دوسرے مرتبہ صرف جملہ ”انت منی بنزلہ مسحارون من موسیٰ اللہ لانبی  
بعدی“، ایک کلی اور تمام جملہ کی صورت میں نقل کی گئی ہے۔ (۱)

اس کے علاوہ یہ حدیث اہل سنت کی دوسری کتابوں، جیسے: ”سنن ابن ماجہ“، ”سنن ترمذی“ اور بہت سی دوسری کتابوں میں نقل کی گئی ہے اور اصحاب  
رسول پر مشتمل اس حدیث کے راویوں کی تعداد بیش افراد سے زیادہ ہے، جن میں جابر بن عبد اللہ انصاری، ابوسعید خدری، عبد اللہ بن مسعود اور معاذ یہ  
بھی شامل ہیں۔

ابو بکر بغدادی نے ”تاریخ بغداد“ میں عمر بن خطاب سے یوں نقل کیا ہے: عمر بن خطاب نے ایک شخص کو حضرت علیؓ کے خلاف براجلا کہتے ہوئے دیکھا  
، عمر نے اس شخص سے کہا: مجھے لگتا ہے کہ تم منافق ہو، کیونکہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنائے  
۱۔ صحیح بخاری ج ۲، ص ۳۲۔ صحیح مسلم ج ۱، ص ۳۲۔ اور ج ۲، ص ۱۸۷۔

کہ آپؐ فرماتے تھے:

”امّا علیٰ ممیٰ بنزلہ مسحارون من موسیٰ اللہ لانبی بعدی“ (تاریخ بغداد، ج ۲، ص ۳۵۲)

”علیٰ علیہ السلام کی نسبت مجھ سے ویسی ہی ہے جیسی ہارون کی موسیٰ سے تھی صرف یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔“

قابل توجہ بات ہے کہ احادیث کے معتر منابع و مأخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات (حدیث منزلت) صرف  
جنگ توک کے موقع پر ہی نہیں فرمائی ہے بلکہ درج ذیل سات موقع پر بیان فرمائی ہے جو اس کے عام اور واضح مفہوم کی دلیل ہے:  
۱۔ ”مکہ کے پہلے مواحات کے دن“۔ یعنی جس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں اپنے اصحاب سے برادری اور اخوت کا عہد و بیان  
باندھا، اس موقع پر آپؐ نے یہی جملہ تکرار فرمایا۔

۲۔ ”مواحات کے دوسرے دن“۔ جب ( مدینہ منورہ میں ) مہاجر و انصار کے درمیان برادری و اخوت کا عہد و بیان باندھا تو اس موقع پر پیغمبر اسلام صلی  
اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث منزلت کو دوسری بار بیان فرمایا۔

۳۔ جس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ مسجد نبوی کی طرف کھلنے والے گھروں کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں اور صرف  
حضرت علیؓ کے گھر کا دروازہ کھلا رہے، تو آپؐ نے اس پر بھی اس جملہ (حدیث منزلت) کو دھرا یا۔

۴۔ ۵۔ ۶۔ اسی طرح غزوہ توک کے دن اور اس کے علاوہ تین اور موقع پر آنحضرتؐ نے اس حدیث کو دھرا یا ہے کہ ان کے مدارک اہل سنت کی  
تمام کتابوں میں ذکر ہوئے ہیں، لہذا نہ سند کے لحاظ سے اس حدیث کے بارے میں کوئی شک و شبہ باقی رہتا ہے اور نہ اس کے عام مفہوم (دلیل) مفہوم  
ہونے کے لحاظ سے۔

## حدیث منزلت کا مفہوم

اگر ہم اپنے ذاتی نظریات سے ہٹ کر، غیر جانبدارانہ طور پر مذکورہ حدیث پر تحقیق و تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ حضرت ہارون کو جو تمام مناسب اور عہدے بنی اسرائیل میں حاصل تھے، حضرت علی علیہ السلام بھی صرف نبوت کے علاوہ ان تمام عہدوں پر فائز تھے، کیونکہ اس حدیث میں نبوت کے عہدے کے علاوہ کوئی اور قید و شرط موجود نہیں ہے۔

اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے:

۱۔ علیؑ امت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے افضل تھے۔ (کیونکہ ہارون کا مرتبہ بھی ایسا ہی تھا)۔

۲۔ علیؑ، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وزیر، خاص نائب اور ہبہ میں آپؐ کے شریک تھے، کیونکہ قرآن مجید نے حضرت ہارون کے لئے یہ تمام منصب اور عہدے ثابت کئے ہیں۔ (سورہ ط، آیت ۲۹ سے ۳۲ تک)

سر، علیؑ، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور خلیفہ تھے، آپؐ کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص اس عہدہ پر فائز نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ حضرت موسیؑ کی نسبت حضرت ہارونؑ بھی بھی مقام و منزلت رکھتے تھے۔

## حدیث "یوم الدار"

اسلامی تواریخ کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوبعثت کے تیرے سال خدا کی طرف سے امر ہوا کہ اپنی خفیہ دعوت اسلام کو آشکار فرمائیں، چنانچہ سورہ شعراء کی آیت نمبر ۲۱۲ میں ارشاد ہوا ہے:

(وَانذِرْ عَشِيرَتَكَ الْاقْرَبَيْنَ)

"اور پیغمبر! آپ اپنے قربی رشتہ داروں کو ڈرایئے۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قربی رشتہ داروں کو اپنے چچا حضرت ابوطالبؓ کے گھر میں کھانے کی دعوت دی، کھانا کھانے کے بعد فرمایا: "اے عبدالمطلب کے فرزندو! خدا کی قسم عرب میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اپنی قوم کے لئے مجھ سے بہتر کوئی چیز لا یا ہو، میں تمھارے لئے دنیا و آخرت کی نیکیاں لا یا ہوں اور خداوند متعال نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کو اس دین (اسلام) کی طرف دعوت دوں، تم میں سے کون (اس کام میں) میری مدد کرے گا تاکہ وہ میرا بھائی، وصی اور جانشین بن جائے؟"

سوائے علی علیہ السلام کے کسی بھی شخص نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعوت پر لبیک نہیں کی۔ حضرت علیؑ ان میں سب سے کم سن تھے، اٹھے اور عرض کی: "اے رسول خدا! میں اس راہ میں آپؐ کا یار و یادو ہوں۔" پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کی

گردوں پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرمایا:

"انْ هُذَا خَيْرٌ وَصَحْلٌ وَخَلِيفٌ فَلَمَّا كَانَ مَعَهُ مَلَكٌ فَأَتَاهُمْ مَعْوَالَهُ وَاطْبَعَهُ"

"یہ تم لوگوں میں میرا بھائی، وصی اور جانشین ہے، اس کی بات سنو اور اس کے حکم کی اطاعت کرو۔"

لیکن اس گمراہ قوم (قریش) نے نہ فقط پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ آپؐ کا مذاق بھی اڑایا۔

مذکورہ حدیث جو کہ حدیث ”یوم الدار“ روز دعوت زوالشیرہ کے نام سے مشہور ہے، کافی حد تک واضح اور گویا ہے۔ اور سند کے ساتھ بہت سے اہل سنت علماء، جیسے: ابن الی حریر، ابن الی حاتم، ابن مردویہ، ابو نعیم، بنیقی، طبری، ابن اشیر، ابوالغفار اور دوسرا لوگوں نے اسے نقل کیا ہے۔ (۱) اگر ہم مذکورہ حدیث کے بارے میں بھی غیر جانبدارانہ طور پر تحقیق و تجزیہ کریں گے تو حضرت علیؓ کی ولایت و خلافت سے مربوط حقائق بالکل واضح ہو جائیں گے کیونکہ اس حدیث میں بھی مسئلہ خلافت و ولایت کے بارے میں صراحةً سے ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ مزید تفصیلات کے لئے کتاب ”المراجعات“، ص ۱۳۰ سے لخ اور کتاب ”احقاق الحق“، ج ۲، ص ۱۶۲ لخ کی طرف رجوع کیا جائے۔

#### غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ حدیث ”منزلت“ کیا ہے؟ اور یہ حدیث کتنے مواعظ پر بیان کی گئی ہے؟

۲۔ حدیث ”منزلت“ کا مفہوم حضرت علیؓ کے لئے کون سے منصب اور عہدے ثابت کرتا ہے؟

۳۔ قرآن مجید کی روشنی میں حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیؑ کی نسبت کون سامرتبہ حاصل تھا؟

۴۔ حدیث ”منزلت“ کو کن علماء نے نقل کیا ہے؟

۵۔ حدیث ”یوم الدار“، اس کا مفہوم، سنداور اس کا نتیجہ بیان کریں۔

## آٹھواں سبق

حدیث "شقین" اور حدیث "سفینہ"

حدیث شقین کے اسناد

اس حدیث کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی ایک بڑی جماعت نے بلا واسطہ (براہ راست) آنحضرت سے نقل کیا ہے بعض بزرگ علماء نے اس حدیث کی روایت کرنے والے اصحاب کی تعداد تیس سے زیادہ بتائی ہے۔ (۱)  
۱۔ سیرہ حلیج ۳۳۳، ص ۳۰۸۔

مفسرین، محدثین اور مورخین کے ایک بڑے گروہ نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ اس طرح اس حدیث کے متواتر ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا ہے۔

بزرگ عالم سید ہاشم بخاری نے اپنی کتاب "غاییۃ المرام" میں اس حدیث کو اہل سنت علماء کے ۹۳ اسناد اور شیعہ علماء کے ۱۸۰ اسناد سے نقل کیا ہے۔ اور عالم بزرگ گوار میر حامد حسین ہندی نے اس حدیث کے بارے میں مزید تحقیقات انجام دی ہیں اور تقریباً دو سو اہل سنت علماء سے یہ حدیث نقل کی ہے اور اس حدیث کے سلسلہ میں تحقیقات کو اپنی عظیم کتاب (احراق الحُقْ) کی چھ جلدیوں میں جمع کیا ہے۔

جن مشہور اصحاب نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، ان میں: ابو سعید خدری، ابو ذر غفاری، زید بن ارقم، زید بن ثابت، ابو رافع، جبیر بن مطعم، یا خذیله، ضمرہ اسلمی، جابر بن عبد اللہ انصاری اور امام سلمہ قابل ذکر ہیں۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ کے بیان کے مطابق اصل حدیث یوں ہے: ابو ذر غفاری اس حال میں کہ خانہ کعبہ کے دروازے کو کپڑے ہوئے تھے، لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر بیان کر رہے تھے: میں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے سنا کہ آپ فرماتے تھے:

(إِنِّي تَارِكُ فِيمَ لَشَقِينَ كَتَابَ السَّلْوَاعِتَى وَ انْهَمَانَ تَقْرِيقَاتِي يَرِدُ عَلَى الْحُوْضِ )  
(جامع ترمذی، طبع نقل یمنیع المودة، ص ۳۷)

"میں تمہارے درمیان دو یادگار گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، قرآن مجید اور میرے اہل بیتؐ۔ یہ دونوں ہر گز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر کے کنارے میرے پاس پہنچ جائیں، پس تم ان کا خیال رکھنا اور دیکھنا تم میری وصیت کا ان کے بارے میں کس قدر لحاظ رکھتے ہو۔"

یہ روایت اہل سنت کے معترض ترین آخذ، جیسے " صحیح ترمذی"، "نسائی"، "مندرجہ"، "کنز العمال" اور " متدرک حاکم" وغیرہ میں نقل ہوئی ہے۔ بہت سی روایتوں میں "شقین" (دو گرانقدر چیزیں) کی تعبیر اور بعض روایات میں "خلفیتین" (دواجنیں) کی تعبیر آئی ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے

ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

دلچسپ بات ہے کہ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث کو مختلف موقع پر لوگوں کے سامنے بیان دلچسپ بات ہے کہ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث کو مختلف موقع پر لوگوں کے سامنے بیان فرمایا۔

”جابر بن عبد اللہ انصاری“ کی روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت نے سفر حج کے دوران عرفہ کے دن اس حدیث (شققین) کو بیان فرمایا۔ ”عبد اللہ بن خطب“ کی روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت نے اس حدیث کو سرز میں جھف (جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ ہے جہاں سے بعض جاج احرام باندھتے ہیں) میں بیان فرمایا۔

”ام سلمہ“ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت نے اس حدیث کو غدیر خم میں بیان فرمایا۔

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث کو اپنی زندگی کے آخری دونوں میں بستر عالت پر بیان فرمایا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے یہ حدیث مدینہ منورہ میں منبر پر بیان فرمائی ہے (۱)۔

حتیٰ اہل سنت کے ایک مشہور عالم ”ابن حجر“ اپنی کتاب ”صواعنق الحرقه“ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں:

”پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث کو بیان فرمانے کے بعد حضرت

الراجعت، ص ۳۲۔

علیؑ کے ہاتھ کو پکڑا خیں بلند کیا اور فرمایا: ”یہ علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے، یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر کے پاس مجھ سے ملیں گے (۱)۔“

اس سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مسئلہ پر ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے بار بار تکید فرمائی ہے اور اس قطعی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے کوئی دقیقة فروگزاشت نہیں کیا ہے تاکہ اسے کبھی فراموش نہ کیا جائے۔

### حدیث شققین کا مفہوم

یہاں پر چند نکات قابل توجہ ہیں:

۱۔ قرآن اور عترت (اہل بیت) کو پیغمبر اسلام کی طرف سے دو ”غلیفہ“ یادو گرانقدر چیزوں کے عنوان سے پیش کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مسلمانوں کو ہر گزان دو چیزوں کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے، بالخصوص اس قید و شرط کے ساتھ جو بہت سی روایتوں میں مذکور ہے: ”اگر ان دو چیزوں کا دامن نہ چھوڑو گے تو ہر گز مگر اونہ ہو گے“، اس سے یہ حقیقت تکید اثبات ہوتی ہے۔

۲۔ قرآن مجید کا عترت کے ساتھ اور عترت کا قرآن مجید کے ساتھ قرار پانہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح قرآن مجید ہر قسم کے انحراف اور خطاء سے محفوظ ہے، اسی طرح عترت اور اہل بیت پیغمبرؐ بھی مرتبہ عصمت کے مالک ہیں۔

۳۔ ان بعض روایتوں میں پیغمبر اسلام نے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صراحت سے

الصواعنق الحرقہ، ص ۵۷

فرمایا ہے: میں قیامت کے دن تم سے ان دو یادگاروں کے ساتھ کئے گئے تمہارے بر تاؤ کے ہارے میں باز پر س کرو گا تاکہ دلکھ لو کہ تمہارا ان کے ساتھ

کیسا سلوک رہا ہے؟

۴۔ بلاشک شبہ، ہم ”عترت اہل بیت“ کی جس طرح بھی تفسیر و توضیح کریں، حضرت علیؑ ان کے نمایاں ترین مصدقہ ہیں۔ اور متعدد روایات کے مطابق آپؐ بھی قرآن مجید سے جدا نہیں ہوئے ہیں اور قرآن مجید بھی آپؐ سے جدا نہیں ہوا ہے۔

اس کے علاوہ متعدد روایتوں میں آیا ہے کہ آیہ ”مبلہ“ کے نازل ہونے کے وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی، فاطمہ حسن اور حسین (علیہم السلام) کو پکار کر فرمایا: ”یہ میرے اہل بیت ہیں۔“ (۱)

۵۔ اگرچہ اس دنیا کی چار دیواری میں مقید ہم لوگوں کے لئے قیامت سے متعلق مسائل پوری طرح واضح نہیں ہیں، لیکن جیسا کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے ”خوض کوثر“ سے مراد بہشت میں موجود ایک خاص نہر ہے جس کے بہت سے خصوصیات ہیں، اور یہ نہر سچے مومنین، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے ائمہ اہل بیتؐ اور ان کے مکتب کے پیروؤں کے لئے مخصوص ہے۔

یہاں تک کی گئی ہماری گفتگو سے واضح ہوتا ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت کے رہبر و قائد حضرت علی علیہ السلام ہیں اور آپؐ کے بعد آپؐ کی نسل سے گیارہ ائمہ ہیں۔

۱۔ مشکوٰۃ المصالح، ص ۵۶۸ (طبع دہلی) ریاض المسفرا، ج ۲، ص ۲۸ (بحوالہ مسلم و ترمذی)۔

#### حدیث سفینہ

اہل سنت اور شیعوں کی کتابوں میں جو دلکش تعبیریں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہیں، ان میں سے ایک مشہور حدیث ”سفینہ نوح“ ہے۔

اس حدیث کے راوی حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے یوں فرمایا:

”آلران مثل اہل بیتی فیکم مثل سفینۃ نوح من رکبها نجی و من تنف عن خاغرق“

”میرے اہل بیت کی مثل کشتی نوح جیسی ہے جو اس میں سوار ہو انجات پا گیا اور جو اس سے جدا ہوا وہ غرق (ہلاک) ہو گیا۔“

(متدرک حاکم، ج ۳، ص ۱۵) (۱)

یہ مشہور حدیث بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام اور اہل بیت پیغمبرؐ کی پیروی و اطاعت کو ضروری اور لازم قرار دیتی ہے۔

چونکہ ایک عظیم اور عالمگیر طوفان کے وقت صرف حضرت نوحؐ کی کشتی نجات کا ذریعہ تھی، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امت مسلمہ میں رونما ہونے والے گمراہی کے طوفان میں راہ نجات صرف ولایت اہل بیت سے تمسک رکھنا تھا اور ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ حدیث "تقلین" کا مفہوم کیا ہے؟ اور یہ حدیث اہل بیتؑ کے لئے کون سے امتیازات و خصوصیات ثابت کرتی ہے؟
- ۲۔ حدیث "تقلین" کو کون لوگوں نے نقل کیا ہے؟
- ۳۔ "تقلین" کے کیا معنی ہیں؟ کیا احادیث میں اس کی بجائے کوئی دوسری تعبیر بھی ذکر ہوئی ہے؟
- ۴۔ حدیث "تقلین" کو پیغمبر اسلام نے کن موقع پر بیان فرمایا ہے؟
- ۵۔ حدیث "سفینہ" کو سنداور مفہوم کے اعتبار سے بیان کیجئے۔

## نواں سبق

بادہ امام

بادہ اماموں کے بارے میں روایات امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی بلا فصل خلافت و امامت کو ثابت کرنے کے بعد اب ہم باقی اماموں کی امامت کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔ اس سلسلہ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے:

آج ہمارے پاس اہل سنت اور اہل تشیع کی متعدد ایسی روایتیں موجود ہیں جو کلی طور پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد "بادہ خلفاء اور ائمہ" کی خلافت کو ثابت کرتی ہیں۔

یہ احادیث اہل سنت کی نہایت اہم اور مشہور کتابوں، جیسے: صحیح بخاری، صحیح ترمذی، صحیح مسلم، صحیح ابی داؤد اور مسنداحمد وغیرہ میں درج ہیں۔

کتاب ”منتخب الائٹر“ کے مصنف نے اس موضوع پر دو سوا کھنڑ احادیث جمع کی ہیں جن کی قابل توجہ تعداد اہل تسنن علماء کی کتابوں سے اور باقی شیعوں کی کتابوں سے نقل کی گئی ہیں۔

مثال کے طور پر، اہل سنت کی مشہور ترین کتاب صحیح بخاری میں اس سلسلہ یوں آیا ہے:

”جابر بن سمرة“ کہتا ہے کہ میں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا: ”یکون اشنا عشر امیراً فقال کلمة لم اسمعها فقال ابی انه قال۔ کلهم من قریش۔“ (صحیح بخاری، ج ۹، کتاب الامقام، ص ۱۰۰)

”میرے بعد بارہ امیر ہوں گے۔ اس کے بعد ایک جملہ فرمایا کہ میں سن نہ سکا۔ میرے باپ نے کہا کہ پیغمبر نے فرمایا تھا: ”وہ سب قریش میں سے ہیں“

”صحیح مسلم“ میں اس حدیث کو یوں نقل کیا گیا ہے کہ ”جابر“ نے کہا: میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا:

”لا يزال الإسلام عزيزاً إلى اثنا عشر خليفة ثم قال كلامه فهمها، فقلت لأبي ما قال فقال كلهم من قریش“ (صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب الناس تعال لقریش)

”اسلام ہمیشہ عزیز رہے گا یہاں تک کہ میرے بارہ خلیفہ و جانشین ہوں گے۔ اس کے بعد ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ میں سن نہ سکا۔ میں نے اپنے باپ سے سوال کیا، تو انہوں نے کہا پیغمبر نے فرمایا: ”وہ سب قریش ہوں گے۔“

کتاب ”منداحمد“ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشہور صحابی عبد اللہ بن مسعود سے نقل کیا گیا ہے کہ لوگوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کے خلفاء

کے بارے میں سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا:

”اثنا عشر کحدۃ نقیباء نیا سرا میل“ (منداحمد، ج ۱، ص ۳۹۸)

”میرے خلفاء، بنی اسرائیل کے نقیباء و ساری کی تعداد کے برابر بارہ ہوں گے۔“

ان احادیث کا مفہوم

ان احادیث میں سے بعض میں ”اسلام کی عزت“ کا دار و مدار بارہ خلیفوں پر قرار دیا گیا ہے اور بعض میں قیامت کے دن کی بقاء اور حیات کو بارہ خلفاء کا مر ہونا منت جانا ہے۔ سب کو قریش سے اور بعض احادیث میں سب کو خاندان ”بنی هاشم“ سے بتایا گیا ہے۔ یہ احادیث مذاہب اسلامی میں سے مذہب شیعہ کے علاوہ کسی مذہب سے تقطیق نہیں کرتی ہیں، کیونکہ شیعوں کے عقیدہ کے مطابق ان کی توجیہ کامل طور پر بالکل صحیح اور واضح ہے، جبکہ اہل سنت علماء کے پاس ان کی توجیہ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

کیا ان (بارہ خلفاء) سے مراد پہلے چار خلفاء اور خلفائے بنی امیہ و بنی عباس ہیں؟

جبکہ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ نہ پہلے خلفاء کی تعداد بارہ تھی اور نہ بنی امیہ کے خلفاء کو ملا کر بارہ بنتی ہے نہ خلفائے بنی عباس کو ملا کر یہ تعداد بارہ بنتی ہے۔ مختصر یہ کہ کسی بھی حساب سے بارہ کی یہ تعداد پوری نہیں ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ بنی امیہ کے خلفاء میں ”یزید“ جیسے اور خلفائے بنی عباس میں ”منصور دوانی“ اور ”ہارون الرشید“ جیسے افراد بھی تھے جن کے ظالم اور جابر ہونے میں کسی کوشش و شبہ نہیں ہے، اس لئے ممکن نہیں ہے ایسے افراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء اور اسلام کی عزت و سربندی کا سبب شمار ہوں، جس قدر بھی ہم خلافت کے معیار کو گھٹائیں، ایسے افراد قطعاً اس دائرے میں نہیں آسکتے ہیں۔

اس بحث سے قطع نظر، شیعوں کے بارہ اماموں کے علاوہ کسی صورت میں بارہ خلفاء کی تعداد کہیں بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

بہتر ہے کہ اس بحث کو ہم اہل سنت کے ایک مشہور عالم کی زبانی پیش کریں:

”سلیمان بن ابراہیم قدوزی حنفی“، اپنی کتاب ”یناچع المودۃ“ میں فرماتے ہیں:

بعض محققین نے کہا ہے: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپؐ کے بارہ خلفاء پر دلالت کرنے والی احادیث مشہور ہیں۔ یہ احادیث مختلف طریقوں سے نقل کی گئی ہیں۔ مرور زمانہ سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس حدیث سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد آپؐ کے اہل بیت اور عترت سے بارہ جانشین ہیں، کیونکہ اس حدیث کو پہلے خلفاء سے مربوط جانا ممکن نہیں ہے، کیونکہ ان کی تعداد چار افراد سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ حدیث بنی امیہ پر بھی تطبیق نہیں ہوتی ہے، کیونکہ وہ بارہ سے زیادہ تھے اور وہ عمر بن عبد العزیز کے علاوہ سب ظالم و ستمگر تھے اور یہ کہ وہ ”بنی ہاشم“ سے نہیں تھے، جبکہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ وہ بارہ کے بارہ بنی ہاشم سے ہیں، جیسا کہ ”عبدالملک بن عمر“ نے ”جابر بن سحرہ“ سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس سوال کے سلسلہ میں کہ وہ (بارہ جانشین) کسی قبلیہ سے ہوں گے؟ آہستہ جواب دینا اس بات کی دلیل ہے کہ بنی ہاشم کی خلافت پر بعض افراد راضی نہیں تھے۔ اسی طرح یہ حدیث خلفائے بنی عباس پر بھی قابل تطبیق نہیں ہے، کیونکہ ان کی تعداد بھی بارہ سے زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے آیہ مودت ”قل لا سَلَّمَ عَلَيْهِ أَجْرًا لَا يَمُوذِّقُ فِي الْقُرْبَى“ (سورہ شوریٰ، ۲۳) پر عمل نہیں کیا ہے اور حدیث کسائے سے چشم پوشی کی ہے؟

ان وجوہات کی بناء پر یہ حدیث صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت و عترت سے تعلق رکھنے والے بارہ اماموں پر ہی قابل تطبیق ہے۔ کیونکہ وہ علم و دانش کے اعتبار سے سب پر فضیلت رکھتے ہیں، اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے بھی سب سے زیادہ زاہد و پر ہیز گار ہیں، اور حسب و نسب کے اعتبار سے بھی سب پر فضیلت رکھتے ہیں اور انہوں نے تمام علوم و فون کو اپنے جدر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وراثت میں حاصل کیا ہے۔ اس نظریہ کی حدیث ثقیلین اور دوسرا بہت سی احادیث تائید کرتی ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہیں۔ ”(یناچع المودۃ، ص ۲۴۶)

دلچسپ بات ہے کہ میں نے اپنے سفر مکہ کے دوران علماء حجاز کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کے دوران اس حدیث کے بارے میں ان سے ایک نئی توجیہ سنی، جس سے ان کی اس سلسلہ میں بے بسی اور عاجزی واضح ہوتی ہے، وہ کہتے تھے: ”شاید بارہ خلفاء اور امراء سے مراد پہلے چار خلیفہ ہیں جو اسلام کی ابتداء میں تھے اور ان کے باقی افراد مستقبل میں آنے والے ہیں جنہوں نے ابھی ظہور نہیں کیا ہے“!

اس طرح، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سے واضح ہونے والے ان خلفاء کے ارتباط سے دیدہ و دانستہ طور پر چشم پوشی کی گئی ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ ہم اس حدیث کی واضح اور روشن تفسیر (جو شیعوں کے بارہ اماموں پر منطبق ہے) کو چھوڑ کر ایسی دلائل میں کو دپڑیں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

نام بنا نامہ کی تعین

قابل توجہ بات ہے کہ اہل سنت راویوں سے ہم تک پہنچی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض احادیث میں صراحت کے ساتھ بارہ اماموں کے نام ذکر ہوئے ہیں اور ان کی خصوصیات و صفات بھی تفصیل سے ذکر ہوئی ہیں۔

اہل سنت کے معروف اور مشہور عالم ”شیخ سلیمان قدوزی“، اپنی اسی کتاب ”یناچع المودۃ“ میں یوں نقل کرتے ہیں:

”نعشل نامی ایک یہودی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کئی سوالات کے ضمن میں آپؐ کے خلافاء اور اوصیاء کے بارے میں سوال کیا۔ آنحضرت نے اپنے جانشینوں کا تعارف یوں کرایا:

ان وصیٰ علی بن ابی طالب و بعدہ سبطائی الحسن و الحسین تلوہ تسعہ ائمۃ من صلب الحسین۔

قال یا محمد فرمدی مسلم لی۔

قال (ص) اذا مرضي الحسين فابنه علي، فاذا مرضي علي فابنه محمد، فاذا مرضي محمد فابنه جعفر، فاذا مرضي جعفر فابنه موسى، فاذا مرضي موسى فابنه علي، فاذا مرضي علي فابنه محمد، فاذا مرضي محمد فابنه علي، فاذا مرضي علي فابنه الحسن، فاذا مرضي الحسن فابنه الحجۃ محمد الحمدی (ع) فخوالاء اثنا عشر۔“ (یناچق المودة، ص ۳۲۳)

”میرے وصیٰ علی بن ابی طالب ہیں اور ان کے بعد میرے دونوں اے حسن اور حسین ہیں اور حسین کے بعد نو امام ان کی نسل سے ہوں گے۔“

یہودی نے کہا: ان کے نام بیان فرمائیے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جب حسین دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے علی ہوں گے، جب علی دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے محمد ہوں گے، جب محمد دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے جعفر ہوں گے، جب جعفر دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے موسیٰ ہوں گے، جب موسیٰ دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے علی ہوں گے، جب علی دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے حسن ہوں گے، اور جب حسن اس دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے جنت محمد الحمدی ہوں گے۔ یہ بارہ امام ہیں۔“ (یناچق المودة، ص ۳۲۴)

اس کے علاوہ اسی کتاب ”یناچق المودة“ میں ”کتاب مناقب“ سے نقل کی گئی ایک اور حدیث درج ہے، جس میں بارہ اماموں کے نام اور ان کے القاب بھی بیان کئے گئے ہیں اور حضرت محمد کی غیبت، اور اس کے بعد ان کے قیام کر کے دنیا کو عدل و انصاف سے اسی طرح پر کرنے کا ذکر کیا گیا ہے جس طرح دنیا اس سے پہلے ظلم و ستم سے بھر گئی ہوگی۔ (یناچق المودة، ص ۳۲۲)

البته اس سلسلہ میں شیعوں کی احادیث بہت زیادہ اور حد تواتر سے بڑھ کر موجود ہیں۔ (غور فرمائیے)۔

جو شخص اپنے زمانہ کے امام کو پہچانے بغیر مر جائے ...

دلچسپ بات ہے کہ اہل سنت کی کتابوں میں ہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی ایک حدیث میں آیا ہے:

”من مات بغیر امام مات میتتہ جا حلیہ“

(المحمد المفسر للفاظ الاحادیث النبوی، ج ۲، ص ۳۰۲)

”جو شخص امام کے بغیر مر جائے، اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔“

شیعہ کتابوں میں بھی حدیث اس عبارت میں نقل ہوئی ہے:

”من مات ولا يعرف امامہ مات میتتہ جا حلیۃ“

”جو شخص مر گیا اور اس نے اپنے امام کو نہیں پہچانا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔“ (بخار الانوار ج ۲، طبع قدیم) ص ۱۶)

یہ حدیث اس بات کی گواہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے ایک معصوم امام موجود ہوتا ہے، اس کو پہچاننا ضروری ہے۔ اس کو نہ پہچانا تھا نقصان دہ ہے کہ انسان کفر و جاہلیت کی سرحد میں پہنچ جاتا ہے۔

کیا اس حدیث میں بیان کئے گئے امام و پیشوائے مراد وہی لوگ ہیں جو زمام حکومت سنبھالتے ہیں، جیسے، چنگیز خان، ہارون اور دوسروں کے ایجنت اور کٹھ پتلی حکام؟

بے شک اس سوال کا جواب منفی ہے، کیونکہ اکثر حکمران غیر صالح، ظالم اور کبھی مشرق و مغرب کی طاقتوں سے وابستہ اور ان غیر کی سیاست کے آله کا ہوتے ہیں، یقیناً ایسے حکمرانوں کو امام کی حیثیت سے قبول کرنا انسان کو جہنم میں پہنچ دیتا ہے۔

لہذا واضح ہوتا ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک معصوم امام موجود ہوتا ہے لوگوں کے لئے اس کو تلاش کر کے اس کی رہبری کو قبول کرنا ضروری ہے۔ البتہ ہر ایک امام کی امامت کو نہ کوہ بلا طریقوں کے علاوہ قرآنی نصوص اور آنے والے امام کے بارے میں ہر سابق امام کی گئی احادیث و روایات نیز ان کے مجررات سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔

### غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ بارہ اماموں کے بارے میں روایات کن کتابوں میں نقل ہوئی ہے؟

۲۔ ان احادیث کا مفہوم کیا ہے؟

۳۔ ان احادیث اور روایات کے بارے میں کی گئی جھوٹی توجیہات بیان کیجئے۔

۴۔ کیا اہل سنت کی احادیث میں بارہ اماموں کے نام آئے ہیں؟

۵۔ بارہ اماموں کو ثابت کرنے کا دوسرا طریقہ کیا ہے؟

## دسوال سبق

حضرت مهدی (ع) بارہویں امام اور  
دنیا کے مصلح اعظم

تاریک شب کا خاتمہ

جب ہم موجودہ حالات پر نظر ڈالتے ہیں اور ظلم و ستم، قتل و غارت، جنگ و خونریزی، اور میں الاقوامی سطح پر کشمکش، اختلافات اور روزمرہ بڑھتی ہوئی اخلاقی برائیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو ہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا یہی حالت جاری رہے گی؟ اور ظلم و ستم اور برائیوں کا دامن اس قدر وسع ہو جائے گا کہ انسانی معاشرہ کو ایک دائیٰ جنگ میں مبتلا کر کے اسے نابود کر دے گا؟ یا اعتقادی انحرافات اور اخلاقی برائیاں اسے ایک متغیر دلدل کے مانند اپنے اندر غرق کر لیں گی؟  
یا نجات و اصلاح کی کوئی امید موجود ہے؟  
اس اہم سوال کے وجواب ہیں:

پہلا جواب، وہ ہے جو بدینتوں اور مادہ پرستوں کی طرف سے دیا جاتا ہے کہ دنیا کا مستقبل تاریک ہے اور ہر دور و زمان میں زبردست خطرہ کا احتمال موجود ہے۔

دوسرے جواب دین داروں کا ہے، یعنی جو لوگ ادیان الہی کے اصولوں کے معتقد ہیں، مخصوصاً مسلمان اور بالخصوص شیعہ، وہ اس سوال کا جواب یوں دیتے ہیں:

اس تاریک رات کے پیچھے ایک امید کی صبح بھی ہے۔  
یہ سیاہ بادل، مہلک طوفان اور تباہ کن سیلا بایک دن ختم ہوں گے اور اس کے بعد صاف آسمان، چکتا سورج اور آرام و آسائش کا ماحول آنے والا ہے۔  
یہ خوفناک بھنوڑ ہمارے سامنے نہیں رہیں گے اور جلدی ہی افتن پر نجات کا ساحل دکھائی دینے والا ہے۔  
دنیا ایک مصلح اعظم کے انتظار میں ہے جو ایک انقلاب کے ذریعہ دنیا کو حق و عدالت سے بھردے گا۔  
البته تمام ادیان کے پیروں اس مصلح اعظم کو الگ الگ ناموں سے جانتے ہیں۔ شاعر عرب نے کیا خوب کہا ہے:  
عبارتانی و حسنک واحد و کل الی ذالک الجمال یثیر

”ہماری تعبیریں مختلف ہیں لیکن آپ کا حسن و زیبائی ایک چیز سے زیادہ نہیں ہے اور ہماری تمام تعبیریں صرف اسی حسن و زیبائی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔“

فطرت اور مصلح عظم کا ظہور

باطنی الہامات کہ جن کی اموج بعض اوقات عقلی فیصلوں سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہیں، نہ صرف خدا کی معرفت کے مسئلہ میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں بلکہ تمام مذہبی اعتقادات میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور مصلح عظم کے ظہور کے مسئلہ میں بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

اس کی علامتیں حسب ذیل ہیں:

پہلی علامت: عالمگیر عدل و انصاف سے عشق و محبت، اس لئے کہ دنیا کے تمام لوگ ہر قسم کے آپسی اختلافات کے باوجود اور بغیر کسی استثناء کے صلح و عدالت سے محبت رکھتے ہیں۔ ہم سب اس کے لئے فریاد بلند کرتے ہیں اور اس راہ میں کوشش کرتے ہیں اور پوری قوت سے عالمگیر صلح و عدالت کے خواہاں ہیں۔

اس مصلح عظم کے ظہور کے فطری ہونے کے باری میں اس سے بہتر کوئی اور دلیل ممکن نہیں ہے، کیونکہ ہر جگہ پر ایک کی آرزوں کا یکساں ہونا ان کے فطری ہونے کی دلیل ہے۔ (غور کیجئے)

ہر حقیقی اور فطری عشق، خارج میں ایک معشوق کے وجود اور اس کی کشش کی علامت ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند متعال نے انسان کے اندر اس بیاس کو پیدا کیا ہو لیکن اس بیاس کو بچانے کے لئے خارج میں کوئی چشمہ موجود نہ ہو؟ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ انسان کی عدالت طلب فطرت بلند آواز میں کہہ رہی ہے کہ آخر کار صلح اور عدل و انصاف تمام دنیا میں پھیل جائے گا اور ظلم و ستم اور خود خواہی ختم ہو کر رہے گی اور انسانیت تمام دنیا میں ایک ملک کی حیثیت سے ایک پرچم تلے مفاہمت اور پاکیزگی کے ساتھ زندگی بسر کرے گی۔ دوسرا علامت: عام طور پر دنیا کے تمام ادیان اور مذاہب میں ایک مصلح عظم کے انتظار کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ تقریباً تمام مذاہب میں اس موضوع پر ایک دلچسپ بات موجود ہے اور بشریت کے جان لیواز خلوں پر مر ہم رکھنے کے لئے ایک عظیم نجات دہند کے ظہور کا عقیدہ صرف مسلمانوں میں ہی نہیں ہے، بلکہ اسناد و مدارک سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عام اور قدیمی اعتقاد ہے جو مشرق و مغرب کے تمام مذاہب میں موجود رہا ہے، اگرچہ اسلام ایک کامل مذہب ہونے کے ناطے اس مسئلہ پر زیادہ تاکید کرتا ہے۔

زرتشتوں کی معروف کتاب ”زند“ میں ”ایزادان“ اور ”اہرینان“ کے درمیان داعی گنج کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے: ”آخر کار ایزادان کو بڑی کا میابی حاصل ہو گی اور اہرینان کو وہ نابود کر دے گا...“

”مکانات اپنی اصلی سعادت کو حاصل کرے گی اور انسان نیک بختی کے تخت پر بیٹھ جائے گا۔“!

کتاب ”جلام سب نامہ“ میں ”زرتشت“ سے نقل کیا گیا ہے:

”منازیان کی سر زمین سے ایک مرد ظہور کرے گا... وہ بڑے سر، بڑے جسم اور بڑی پنڈلیوں والا ایک مرد ہو گا جو اپنے جد کے دین پر ہو گا اور اس کے ساتھ ایک بڑی فوج ہو گی... وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔“

ہندوؤں کی کتاب ”وشنو گ“ میں یوں آیا ہے:

”سر انجام دنیا ایک ایسے شخص کی طرف پڑے گی جو خدا کو دوست رکھتا ہو گا اور خدا کے خاص ہندوؤں میں سے ہو گا۔“  
ہندوؤں کی کتاب ”باسک“ میں آیا ہے:

”آخری زمانہ میں ایک بادشاہ پر دنیا کا اختمام ہو گا، وہ فرشتوں، جنوں اور انسانوں کا پیشواد ہو گا، حقیقت میں حق اس کے ساتھ ہو گا، جو کچھ سمندروں، دریاؤں، زمینوں اور پہاڑوں میں پوشیدہ ہے، وہ ان سب چیزوں کو حاصل کرے گا۔ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اس کی خبر دے گا اور اس سے بڑی کوئی شخصیت دنیا میں نہیں آئے گی۔“

عہد قدیم (تورات اور اس کے ملحقات) کی کتاب ”مز امیر داؤد“ میں درج ہے:

”شر پسند لوگ نابود ہو جائیں گے لیکن خدا پر توکل کرنے والے زمین کے وارث ہو جائیں گے۔“  
اسی کتاب کی اسی فصل میں آیا ہے:

”پچ لوگ زمین کے وارث ہو کر ہمیشہ کے لئے اس کے ساکن ہو جائیں گے۔“

اسی کے مانند عبارت، کتب تورات سے مربوط ”اشعیای نبی“ کی کتاب میں بھی آئی ہے۔

انجیل ”متی“ کی ۲۴ ویں فصل میں یوں آیا ہے:

”جس طرح بجلی مشرق سے چک کر مغرب تک پہنچتی ہے، اسی طرح فرزند انسان بھی ظہور کرے گا۔“...

انجیل ”لوقا“ کی بارہویں فصل میں بیان ہوا ہے:

”اپنی کمریں کس کے رکھو، اپنے چراخوں کو جلائے رکھو، اور اس شخص کے اندر ہو جو اپنے ماں کے انتظار میں ہوتا ہے تاکہ جوں ہی وہ آجائے اور دروازہ کھٹکھٹائے تو فور اس کے لئے دروازہ کھول دیں!“

کتاب ”علام الظہور“ میں یوں آیا ہے:

”چینیوں کی قدیم کتابوں، ہندوؤں کے عقائد، اسکنڈیٹینوی باشندوں، حتیٰ قدیم مصریوں اور میکسیکو کے باشندوں اور ان جیسے دوسرے لوگوں میں ایک مصلح اعظم کے ظہور کا عقیدہ پایا جاستا ہے۔“

عقلی دلائل

الف۔ خلقت کا نظام ہمیں یہ سبق سکھاتا ہے کہ عالم بشریت کے لئے سرانجام عدل و انصاف کے قانون کے سامنے ہتھیار ڈال کر ایک عادلانہ نظام اور پادر مصلح کے سامنے سرتاسری ختم کرنا ضروری ہے۔

اس بات کی وضاحت یوں ہے: جہاں تک ہمیں علم ہے، کائنات مختلف نظاموں کا ایک مجموعہ ہے، اس پوری کائنات میں منظم قوانین کا وجود اس نظام کی وحدت اور ہم آہنگی کی دلیل ہے۔

نظم و ضبط، قانون اور حساب و کتاب اس کائنات کے بنیادی مسائل میں شمار ہوتے ہیں۔

عقلیم اور وسیع نظاموں سے لے کر ایک ائمہ کے ایک ذرے تک (کہ لاکھوں ذرے ایک سوئی کی نوک پر ساکتے ہیں) سب کے سب ایک دقيق نظام کے تحت ہیں۔

ہمارے بدن کے مختلف اعضا، ایک چھوٹی اور حیرت انگیز خلیہ کی بناوٹ سے لے کر مغروہ اعصاب، پھیپھڑے اور دل کے کام کرنے کے طریقہ تک، ایک ایسے نظام کے تحت چل رہے ہیں کہ بعض دانشوروں نے ان میں سے ہر ایک عضو کو انسان کے بدن میں ایک ایسی صحیح اور دقیق گھڑی سے تشیبیہ دی ہے کہ منظم اور پیچیدہ ترین کمپیوٹر بھی اس کے سامنے ناجیز ہے۔

کیا ایسی منظم کائنات میں انسان، جو اس "کل" کا ایک "جزء" ہے، ایک ناموافق اور نامنظم حصہ کے مانند، جنگ و خونریزی اور ظلم و ستم میں زندگی بسر کر سکتا ہے؟!

کیا بے انصافیاں اور اخلاقی و اجتماعی برائیاں، جو ایک قسم کی بے نظری ہیں، انسانی معاشرے پر ہمیشہ حاکم رہ سکتی ہیں؟ نتیجہ: کائنات کے نظام کا مشاہدہ ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ سرانجام انسانی معاشرہ بھی ایک دن نظم و انصاف کے سامنے سرتسلیم خم کر کے اپنی خلقت کی اصلی راہ کی طرف لوٹے گا۔

ب۔ معاشروں کا ارتقائی سفر، عالم بشریت کے روشن مستقبل کی ایک اور دلیل ہے، کیونکہ ہم اس حقیقت سے ہر گزار کار نہیں کر سکتے ہیں کہ جب سے انسانی معاشرہ نے اپنے آپ کو پہچانا ہے، وہ کبھی ایک جگہ پر رکا نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ آگے کی طرف حرکت کرتا رہا ہے۔ مادی لحاظ سے انسان کا گھر، لباس، غذا اور آمد و رفت اور حمل و نقل کے ذرائع ایک دن بالکل سادہ اور ابتدائی مرحلہ میں تھے۔ آج یہی چیزیں ترقی کے ایک ایسے مرحلے پر پہنچی ہیں کہ عقلیں متحیر را اور آنکھیں خیر ہو جاتی ہیں اور ارتقاء کا یہ سفر یقیناً جاری ہے۔

انسان، علم و دانش اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بھی مسلسل ترقی کر رہا ہے اور اس سلسلہ میں ہر روز نئی ایجادات، تحقیق اور نئے مطالب حاصل کر رہا ہے۔

اس "قانون ارتقاء" میں سرانجام معنوی اور اخلاقی و اجتماعی پہلو بھی شامل ہیں اور انسانیت کو ایک عادلانہ قانون، پائیدار عدل و انصاف، اخلاقی و معنوی فضائل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اگر آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ معاشروں میں اخلاقی برائیاں روز بروز اضافہ ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ سلسلہ تدریجیاً خود بھی ایک تکاملی انقلاب کے لئے موقع فراہم کرے گا۔

ہم کبھی نہیں کہتے کہ برائیوں اور فسادوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے، لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ جب فساد اور برائیاں حد سے گزر جائیں گی، تو اس کا رد عمل ایک اخلاقی انقلاب ہو گا۔ جب انسان اپنے گناہوں کے نامطلوب عواقب کے نتائج میں بے بس ہو جائیں گے تو اس وقت وہ کم از کم ایک الٰہی رہبر کی طرف سے پیش کئے جانے والے قانون کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

قرآن مجید اور ظہور حضرت مہدی (ع) (

قرآن مجید میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں جو حضرت مہدی (ع) کے ظہور کی بشارت دیتی ہیں۔ ہم ان آیات میں سے صرف ایک آیت پر اتفاق کرتے ہیں:

سورہ نور کی آیت نمبر ۵۵ میں ارشاد ہوتا ہے :

(وَعَدَ السَّالِذِينَ أَمْنَوْا مُكْثُمًا وَعَلَوْا اِصْلَاحًا لِيُسْتَحْفَنُّهُمْ فِي الارضِ كَمَا سُتْحَفَ النَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ )

"اللہ نے تم میں سے صاحبان ایمان و عمل صالح سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں روئے زمین میں اسی طرح اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے والوں کو بنایا

ہے۔“

اس آئی شریفہ سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ زمین پر آخر کار ظالم و جابر حکمرانوں کی حکومت ان سے چھین لی جائے گی اور ان کی جگہ پر صالح مؤمن حکومت کریں گے۔

اسی آیت کے آخر میں مذکورہ وعدہ کے علاوہ مندرجہ ذیل تین اور وعدے بھی دئے گئے ہیں:

۱- دین کا غلبہ اور دلوں میں اللہ کی حکومت کا معنوی نفوذ:

(ولیکن لحم دینہم اللہی ارتقی لحم )

”اور ان کے لئے اس دین کو غالب بنائے گا جسے ان کے لئے پسندیدہ قرار دیا ہے۔“

۲- ہر قسم کی بد امنی کا امن و امان میں تبدیل ہونا:

(ولیبِ لِتُحَمِّمْ مِنْ بَعْدِ خُوفِهِمَا )

”اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کر دے گا۔“

۳- پوری دنیا سے شر کا خاتمه ہونا:

(یعبد و نتی لا یشرکون بی شیمل )

”وہ لوگ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی طرح کا شرک نہ کریں گے۔

حضرت امام علی بن الحسین (زین العابدین) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے:

”حُمْ وَاللَّهُ شَيْعَتِنَا يَفْعُلُ السَّذِّلَكْ بِحُمْ عَلَى يَدِي رَجُلٌ مَنَّا وَهُوَ مُحَمَّدٌ حَذَّهُ الْأَمْمَةُ“

”خد اکی قسم یہ لوگ وہی ہمارے شیعہ ہیں، خداوند متعال ہمارے خاندان کے ایک شخص کے ذریعہ اس موضوع (حکومت الٰہی) کو محقق فرمائے گا اور وہ

اس امت کا مهدی ہے،“ (تفسیر مجتبی النبیان، سورہ نور کی آیت ۵۵ کے ذیل میں)

احادیث میں حضرت مهدی (ع) کا ذکر

شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں اس موضوع پر، کہ صلح و سلامتی، امن و امان اور عدل و انصاف پر مبنی عالمی حکومت پیغامبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے خاندان سے مر بوط

”مهدی“ نامی ایک شخص کے ذریعہ تشكیل پائے گی، احادیث اس قدر زیادہ ہیں کہ تواتر کی حد سے بھی آگے بڑھ گئی ہیں۔

اس کے علاوہ شیعوں کی کتابوں میں بھی اس موضوع پر احادیث متواتر ہیں کہ وہ (مهدی موعود) بارہویں امام، جاثشین پیغمبر، امام حسینؑ کے نویں فرزند اور

امام حسن عسکری کے بلا فصل فرزند ہیں۔

اہل سنت کی احادیث

اہل سنت کی کتابوں میں ”ظہور مهدیؑ“ سے متعلق احادیث کے متواتر ہونے کے سلسلہ میں اتنا ہی کافی ہے کہ اہل سنت علماء نے اس موضوع کو اپنی کتابوں میں واضح طور پر ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ جواز میں اہل سنت کے عالمی سطح کے سب سے بڑے دینی مرکز ”رباطہ عالم اسلامی“ نے اس موضوع کے

بارے میں حال ہی میں اپنے ایک رسالہ میں یوں لکھا ہے:

”وہ (مہدی موعود) بارہ خلفائے راشدین میں آخری غیفہ ہیں کہ جن کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحیح احادیث میں خبر دی ہے اور مہدی (ع) سے متعلق احادیث، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے صحابیوں سے نقل کی گئی ہیں۔“

اس کے بعد حضرت مہدی (ع) سے متعلق احادیث نقل کرنے والے ”میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

”ان کے علاوہ بہت سے مختلف گروہوں نے بھی احادیث نقل کی ہیں... بعض اہل سنت علماء نے حضرت مہدی سے مربوط احادیث کے بارے میں خصوصی کتابیں لکھی ہیں، جن میں ابو نعیم اصفہانی، ابن حجر یشیعی، شوکانی، اور یس مغربی اور ابوالعباس بن مؤمن قبل ذکر ہیں۔“

اس کے بعد لکھتے ہیں :

”اہل سنت کے گزشتہ موجودہ علماء کے ایک گروہ نے مہدی (ع) سے مربوط احادیث کے متواتر ہونے کی تصریح کی ہے۔“

اس کے بعد ان علماء میں سے بعض کا نام ذکر کرنے کے بعد اپنی گفتگو کا خاتمه اس عبارت پر کرتے ہیں :

”حافظ اور محدثین کی ایک جماعت نے واضح طور پر کہا ہے کہ مہدی (ع) سے مربوط احادیث صحیح بھی ہیں اور حسن بھی اور مجموعی طور پر یہ سب احادیث متواتر ہیں اور مہدی کے قیام کا عقیدہ واجب ہے اور یہ اہل سنت والجماعت کے قطعی اور مسلم عقائد میں سے ہے۔ جاہل اور بدعتی افراد کے علاوہ کوئی بھی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا ہے۔“

### شیعوں کی احادیث

اس سلسلہ میں اسی قدر جاننا کافی ہے کہ اس موضوع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور انہمہ اطہار سے سینکڑوں احادیث نقل کی گئی ہیں، یہاں تک کہ یہ احادیث تو اتر کی حد سے بھی آگے بڑھ گئی ہیں۔ شیعوں کے نزدیک امام مہدی (ع) کا عقیدہ ضروریات دین میں شمار ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص شیعوں کے نزدیک رہ کر حضرت مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں شیعوں کے عقائد، حضرت مہدی کی بہت سی خصوصیات، علامؑ ظہور، ان کے طرز حکومت اور نظام کے بارے میں آگاہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

شیعوں کے بزرگ علماء نے ابتدائی صدیوں سے آج تک اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں اور ان میں اس سلسلہ کی احادیث جمع کی ہیں۔

ہم یہاں پر نمونے کے طور پر چند احادیث کے ذکر کرنے پر اتفاقاً کرتے ہیں

اور تفصیلی مطالعہ کا شوق رکھنے والے قارئین کو درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنے کی تاکید کرتے ہیں :

”محمدی انقلابی بزرگ“، ”نوید امن و امان“ اور علامہ صدر الدین صدر کی کتاب ”المحمدی“۔

پیغمبر اسلامؑ نے فرمایا:

”لَوْمَيْتُ مِنَ الدَّهْرِ الْأَيُّومَ لِطُولِ السَّذْلَكِ الْيَوْمِ حَتَّى يَعْثُرَ جَلَامِنَ أَهْلَ بَيْتِ يَمْلَأُهَا قَسْطَأَ وَعَدَلَ كَمَالَتْ ظَلَمًا وَجَوَرًا“

”اگر دنیا کی زندگی کا صرف ایک دن باقی رہ جائے، خداوند متعال اس دن کو اتنا طولانی کرے گا کہ میرے خاندان میں سے ایک شخص کو مبعوث کرے تا کہ وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے جس طرح و ظلم و جور سے بھری ہوئی ہوگی۔“

(یہ حدیث اہل سنت اور شیعوں کی اکثر کتابوں میں نقل ہوئی ہے)

ایک دوسری حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

اذا قام القائم حکم بالعدل وارتفع الجور فی ایامہ وامنت بہ السبل واخرجت الارض بر کا تھا، ورد کل حق الی احله،... و حکم بین الناس بحکم داود و حکم محمدؐ فحیندز تظہر الارض کنو زھا، و تبدی بر کا تھا، والیجید الرجل ممکن یومیند موضع عاصدۃ ولبرہ، لشمول الغنی جمیع المؤمنین،“!

”جب قائمؑ قیام (ظہور) فرمائیں گے، تو حکومت کو عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم کریں گے، ان کے دور حکومت میں ظلم و ستم کا خاتمه ہو گا، ان کے وجود کی برکت سے راستے پر امن بن جائیں گے، زمین اپنی برکتوں کو اگل دے گی اور ہر شخص کو اپنا حق ملے گا،... وہ حضرت محمدؐ اور حضرت داؤدؑ کے مانند لوگوں کے مسائل حل کریں گے، اس وقت زمین اپنے اندر پوشیدہ خزانوں کو آشکار کر دے گی اور اپنی برکتوں کو ظاہر کر دے گی اور محتاجوں کا کہیں نام و نشان نہیں ملے گا کیونکہ تمام مومنین بے نیاز اور مستغفی ہوں گے“...

(بخار الانوار، ج ۱۳) (طبع قدیم)

ہم جانتے ہیں کہ حضرت محمدؐ کی غیبت کے دوران امامت و ولایت کے راستہ کی بقا امام زمانہؑ کے عام نائیین یعنی علماء و فقہاء کے ذریعہ ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے:

۱۔ دنیا کے مستقبل کے بارے میں خدا پرستوں اور مادہ پرستوں کے نظریات میں کیا فرق ہے؟

۲۔ کیا فاطر کے طریقہ سے ظہور محدثؑ کو ثابت کیا جاسکتا ہے؟ اور کیسے؟

۳۔ کیا ظہور محدثؑ کے بارے میں کوئی عقلی دلیل موجود ہے؟

۴۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کیا فرماتا ہے؟

۵۔ اس موضوع پر سنت کا بیان کیا ہے؟

معاد

کے بارے میں

دس سبق

## پہلا سبق

ایک اہم سوال

موت اختتام ہے یا آغاز؟

اکثر لوگ موت سے ڈرتے ہیں، کیوں؟

موت ہمیشہ انسان کی آنکھوں کے سامنے ایک وختناک ہولاکے مانند جسم ہوتی رہی ہے۔ موت کی فکر و اندیشه نے بہت سوں کی زندگی کی شیرینی کے کام و دہن کو تلخ بنادیا ہے۔

لوگ، نہ صرف موت سے ڈرتے ہیں بلکہ قبرستان کے نام سے بھی نفرت کرتے ہیں اور قبروں اور قبرستانوں کو زرق و برق اور آرائستہ کر کے ان کی اصلی ماہیت کو بھلانا چاہتے ہیں۔

دنیا کی مختلف ادبیات میں یہ خوف واضح طور پر نمایاں ہے اور ہمیشہ اسے ”موت کا ہولا“، ”موت کا پنجہ“ اور ”موت کا طماںچہ“ جیسی تعبیرات سے یاد کیا جاتا ہے!

جب کسی مردہ کا نام لیتے ہیں، تو مخاطب کو خوف و حشت سے بچانے کے لئے ”اب سے روز“، ”میری زبان گنگ ہو“، ”سات پہاڑوں سے دور“، ”اس کی مٹی کے برابر تھاری عمر ہو“ جیسے جملے کمکر مخاطب اور موت کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عام تصور کے بر عکس کیوں بعض لوگ نہ صرف موت سے نہیں ڈرتے تھے بلکہ موت کے وقت ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوا کرتی تھی اور فخر کے ساتھ موت کا استقبال کرتے تھے؟

تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب کچھ لوگ آب حیات اور جوانی کی اکسیر کے پیچھے ڈرتے تھے تو اسی وقت بعض لوگ عاشقانہ طور پر جہاد کے محاذوں کی طرف ڈرتے تھے اور موت کا مسکرا کر استقبال کرتے تھے اور کبھی اپنی طولانی زندگی سے شکوہ کرتے ہوئے اپنے معشوق کے دیدار کے دن اور لقاء اللہ کی آرزو اور تمثیل کرتے تھے۔ اور آج بھی ہم حق و باطل کے محاذ پر ان ہی مناظر کا واضح طور پر مشاہدہ کرتے ہیں کہ کس طرح سر فروش مجاہدین شہادت کے استقبال کے لئے ڈرتے ہیں۔

خوف موت کا اصلی سبب

غور و فکر اور تحقیق کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس دلائلی خوف و حشت کا اصلی سبب صرف دو چیزیں ہیں:

۱۔ موت کو فناس بھانا

انسان ہمیشہ نیستی (عدم) سے بھاگتا ہے۔ یہاری سے بھاگتا ہے کیونکہ یہ صحت و سلامتی کی نیستی ہے، تاریکی سے خائف ہے کیونکہ یہ روشنی کی نیستی ہے۔ فقر و محتاجی سے ڈرتا ہے کیونکہ یہ تو گنری کی نیستی ہے۔ حتیٰ کہ انسان کبھی ایک خالی گھر سے بھی ڈرتا ہے اور ایک سنسان بیباں میں خوف سے دوچار ہو جاتا ہے کیون کہ وہاں پر کوئی نہیں ہوتا!

تعجب کی بات یہ ہے کہ انسان خود مردہ سے بھی ڈرتا ہے، مثال کے طور پر ایک ایسے کمرے میں رات گزارنے کے لئے کبھی حاضر نہیں ہوتا ہے جس میں کوئی مردہ پڑا ہو، حالانکہ جب وہی انسان زندہ تھا تو وہ اس سے نہیں ڈرتا تھا!

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کیوں عدم اور نیستی سے خائف ہوتا ہے۔ اس کا سبب واضح ہے کہ، ہستی اور ہستی کے درمیان چوپی دامن کا ساتھ ہوتا ہے، ایک موجود چیز دوسری موجود چیز سے آشنا ہوتی ہے۔ وجود اور عدم کے درمیان ہر گز واقفیت نہیں ہوتی ہے، اس لئے نیستی سے ہماری اجنیبت بالکل فطری بات ہے۔

اب اگر ہم موت کو تمام چیزوں کا غائب ہے سمجھیں اور تصور کریں کہ مرنے سے تمام چیزیں ختم ہو جاتی ہیں تو ہمیں اس سے ڈرنے کا حق ہے، یہاں تک کہ ہم اس کے نام اور تصور سے بھی وحشت کریں تو حق ہے، کیونکہ موت ہم سے ہر چیز کو چھین لیتی ہے۔

لیکن اگر ہم موت کو ایک نئی زندگی، ابدی حیات کا آغاز اور ایک عظیم دنیا کی طرف کھلنے والا دریپہ سمجھیں تو فطری طور پر نہ صرف اس سے وحشت زدہ نہیں ہوں گے بلکہ اس کی طرف پاکیزگی اور سر بلندی سے قدم بڑھانے والوں کو مبارک باد بھی دیں گے۔

## ۲۔ سیاہ اعمال نامے

ہم بعض ایسے افراد کو بھی جانتے ہیں جو موت کو نابودی اور نیستی سے تجیر نہیں کرتے ہیں اور مرنے کے بعد دنیا کی کے ہر گز متکر نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود موت سے ڈرتے ہیں۔

انھیں موت سے ڈرنے کا حق ہے، ان کی مثال ان خطرناک مجرموں کی جیسی ہے، جو زندان سے باہر نکالے جانے سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ انھیں زندان سے باہر لے جانے کی صورت میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔

وہ زندان کی سلاخوں سے محکم چھپتے رہتے ہیں، اس لئے نہیں کہ وہ آزادی سے تنفر ہیں، بلکہ وہ اس آزادی سے ڈرتے ہیں جس کا نتیجہ موت کی سزا ہے، اسی طرح وہ بد کار اور ظالم بھی موت سے ڈرتے ہیں جو اپنے بدن سے روح کے ٹکلنے کو اپنے برے اعمال اور ظلم و ستم کی ناقابل برداشت سزا کا مقدمہ جانتے ہیں۔

لیکن جو لوگ نہ موت کو ”فنا“ جانتے ہیں اور نہ ان کا ”اعمال نامہ سیاہ“ ہوتا ہے، وہ موت سے کیوں ڈریں؟

بے شک ایسے لوگ زندگی کو بھی پورے وجود سے چاہتے ہیں، لیکن اس زندگی سے موت کے بعد دنیا میں نئی زندگی کے لئے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے، ایسی موت کا استقبال کرتے ہیں جو خدا کی مرضی، اس کے مقصد اور افتخار کے لئے ہو۔

دو مختلف نظریے

ہم نے کہا کہ لوگ دو طرح کے ہیں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو اکثریت میں ہیں، وہ موت سے بیزار اور تنفر ہیں۔

لیکن دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اس موت کا استقبال کرتے ہیں جو ایک عظیم مقصد کی راہ میں ہو جیسے خدا کی راہ میں شہادت، یا کم از کم جب احساس کرتے ہیں کہ ان کی طبعی عمر آخر تک پہنچنے کی توان پر کسی بھی قسم کا غم و اندوه طاری نہیں ہوتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ دونوں گروہوں کے دو مختلف نظریے ہیں:

پہلا گروہ: ان لوگوں کا ہے جو یا تو موت کے بعد دنیا کا بالکل ایمان و عقیدہ نہیں رکھتے ہیں یا بھی پوری طرح اس پر یقین پیدا نہیں کر سکے ہیں، لہذا یہ لوگ موت کے لحہ کو تمام چیزوں کو اولادع کہنے کا لحہ جانتے ہیں، البتہ تمام چیزوں کو اولادع کہنا وہ ختنا ک ہے، نور اور روشنی سے نکل کر مطلق تاریکی میں قدم رکھنا بہت ہی دردناک ہے۔

اسی طرح کسی مجرم کا زمان سے آزاد ہو کر ایک عدالت میں پیش ہونا بھی وحشتناک ہے جہاں پر اس کے جرم کے اسناد آشکار ہوں۔  
دوسرा گروہ: یہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو موت کو ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایک محدود و تاریک ماحول سے باہر نکل کر ایک وسیع اور نوافی عالم میں قدم رکھنا جانتے ہیں۔

ان لوگوں کی نظروں میں موت، ایک تنگ اور چھوٹے بخوبی سے آزاد ہو کر لا محدود آسمان میں پرواز کرنا اور تنگ نظریات، لڑائی جھگڑوں، کشمکشوں، نارا خلیلیوں، کینہ تو زیوں اور جنگ و جدل سے بھرے ایک ماحول سے نکل کر ایک ایسی وادی میں قدم رکھنا ہے جو ان تمام آلو دیگوں سے پاک ہو۔ فطری بات ہے کہ ایسے لوگ اس قسم کی موت سے خوفزدہ ہوں اور حضرت علیؓ کے مانند کہیں:

”لَا بَنَابِي طَالِبٌ أَنْسٌ بِالْمُوْتِ مِنَ الطَّفْلِ بَشِّدِي أَمْهٰ“

”خد اکی قسم فرزند اپی طالب کو موت سے انس اس شیر خوار بچے سے زیادہ ہے جو اپنی ماں کی چھاتیوں سے انس رکھتا ہے۔

”یاقار سی شاعر کے مندرجہ ذیل اشعار کے مانند کہیں:

مرگ اگر مرداست گو نزد من آئی تادر آغوشش گیرم تنگ تنگ!

من ازو جانی تا نم جاؤ دان او زہ من د لقی ستاندر نگ رنگ!

(موت اگر دلیر ہے تو اس سے کہدا کہ میرے پاس آجائے تاکہ میں اسے اپنی گود میں لے لوں۔ میں نے اس سے جاؤ دانہ زندگی حاصل کی ہے اور اس نے مجھ سے ایک درویشانہ پیرا ہن لیا ہے)۔

یہ بلاوجہ نہیں ہے کہ ہم تاریخ اسلام میں ایسے افراد کو پاتے ہیں، جو امام حسین علیہ السلام اور ان پر جان پچھاوار کرنے والے ساتھیوں کے مانند جس قدر شہادت کا لمحہ ان کے نزدیک آتا تھا، ان کے چہروں پر شادابی بڑھتی جاتی تھی اور اپنے پروردگار سے ملاقات کرنے کے شوق میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ اسی لئے ہم حضرت علی علیہ السلام کی فخر و مبارکات سے بھری زندگی کی تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ جب ظالم قاتل کی تلوار کی ضرب آپؐ کے سراقدس پر گلی تو آپؐ نے فرمایا:

”فَرَتَ وَرَبُّ الْكَعْبَةِ“

”رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا“

یہ واضح ہے کہ س کامطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ انسان خوا مخوا اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دے اور زندگی کی عظیم نعمت سے چشم پوشی کر لے اور عظیم مقاصد تک پہنچے کے لئے اس سے استفادہ نہ کرے۔

بلکہ مقصود یہ ہے کہ زندگی سے پورا پورا استفادہ کرے لیکن اس کے خاتمہ سے ہر گز خوف زدہ ہو خاص کر اس وقت جب وہ عظیم مقاصد کی راہ پر گامزن ہو۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ لوگ کیوں موت سے ڈرتے ہیں؟ اس کا سبب کیا ہے؟
- ۲۔ بعض لوگ کیوں موت کا مسکراہٹ سے استقبال کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں شہادت کے عاشق ہوتے ہیں؟
- ۳۔ موت کے لمحہ کو کس چیز سے تشبیہ دی جاسکتی ہے؟ بالیمان پاکیزہ لوگ کیا احساس کرتے ہیں اور بے ایمان ناپاک لوگ کیا محسوس کرتے ہیں؟
- ۴۔ کیا آپ نے اپنی زندگی میں کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا ہے؟ ان کا کون سا واقعہ آپ کو یاد ہے؟
- ۵۔ موت کے بارے میں حضرت علیؑ کیا نظر یہ ہے؟

## دوسرा سبق

معاذ زندگی کو معنی بخشتی ہے

اگر ہم اس دنیا کی زندگی کو دوسرا دنیا (آخرت) کی زندگی سے قطع نظر تصور کریں تو یہ بالکل بے معنی اور فضول ہو گی۔  
اس صورت میں ہماری اس دنیا کی زندگی بالکل اس کے مانند ہو گی کہ ہم جنین کے دوران بچے کی زندگی اس دنیا کی زندگی سے قطع نظر تصور کریں۔  
ماں کے شکم میں موجود بچہ، جو اس محدود و تنگ و تاریک زندان میں مہینوں قید و بند رہتا ہے، اگر عقل و شعور کھتا اور اپنی جنین والی زندگی کے بارے میں فکر کرتا تو وہ بیشک تعجب کرتا:

میں کیوں اس تاریک زندان میں قید و بند ہوں؟

میں کیوں اس پانی اور خون میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں؟

آخر میری زندگی کا کیا نتیجہ ہو گا؟

میں کہاں سے آیا ہوں اور میرے آنے کا کیا فائدہ ہے؟

لیکن اگر اسے بتایا جائے کہ یہ تیرے لئے ایک ابتدائی مرحلہ ہے یہاں پر تمہارے اعضاء بن جائیں گے، تو انہو جاؤ گے اور ایک بڑی کوشش و حرکت کے

لئے آمادہ ہو جاؤ گے۔

نومبینے گزرنے کے بعد اس زندان سے تمہاری رہائی کا حکم جاری کیا جائے گا۔ اس کے بعد تم ایک ایسی دنیا میں قدم رکھو گے جہاں پر چکتا سورج، روشن چاند، سر بزدرخت، پانی کی جاری نہریں اور گوناگوں نعمتیں ہوں گی۔ یہ سننے کے بعد وہ اطمینان کا سائز لے کر کہے گا! اب میں سمجھ گیا کہ یہاں پر میری موجودگی کا فلسفہ کیا ہے!

یہ ایک ابتدائی مرحلہ ہے، یہ چھلانگ لگانے کا چبوترہ ہے، یہ ایک بڑی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لئے ایک کلاس ہے۔ لیکن اگر جنین والی زندگی کا رابطہ اس دنیا سے کٹ جائے تو تمام چیزیں تاریک اور بے معنی ہو کر رہ جائیں گی اور جنین والی زندگی ایک دھشتناک، تکلیف دہ، اور بے نتیجہ زندان میں تبدیل ہو جائے گی۔

اس دنیا کی زندگی اور موت کے بعد والی دنیا کے درمیان بھی ایسا ہی رابطہ ہے۔

کیا ضروری ہے کہ ہم اس دنیا میں ستر سال یا اس سے کم یا زیادہ زندگی گزاریں اور مشکلات کے درمیان ہاتھ پاؤں مارتے رہیں؟ کچھ مدت بے تجربہ اور خام رہیں، جب ہماری خامی پختگی میں تبدیل ہو تو ہماری عمر تمام ہو جائے!

ایک مدت تک علم و دانش حاصل کریں، جب ہم معلومات کے لحاظ سے پختہ ہو جاتے ہیں تو بڑھا پا ہمارے سر پر آپنچتا ہے! آخر ہم کس لئے زندگی بس کرتے ہیں؟ غذا کھانے، لباس پہننے اور سونے کے لئے؟ اسی حالت میں زندگی کو دسیوں سال تک جاری رکھنے کا مطلب کیا ہے؟

کیا حقیقت میں یہ کشادہ آسمان، و سیق زمین، یہ سب مقدمات، یہ علم اور تجربے حاصل کرنا، یہ سب اساتذہ اور مرتبی سب کے سب صرف اسی کھانے پینے اور لباس پہننے اور پست و تکراری زندگی کے لئے ہیں؟

یہاں پر معاد کو قبول کرنے والوں کے لئے زندگی کا فضول ہونا یقینی بن جاتا ہے، کیونکہ وہاں معمولی امور کو زندگی کا مقصد قرار نہیں دے سکتے ہیں اور موت کے بعد والی دنیا پر تو ایمان ہی نہیں رکھتے ہیں۔

اہم اشادہ کیا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ خود کشی کا اقدام کر کے اس بے مقصد زندگی سے نجات پانا چاہتے ہیں۔

لیکن اگر ہم یقین کریں کہ دنیا "آخرت کی کھیتی" ہے، دنیا ایسا کھیت ہے جس میں ہمیں فتح بونا ہے تاکہ اس کی فصل کو ہم ایک جاودا نی اور ابدی زندگی میں کاٹ سکیں۔

دنیا ایک ایسا کالج ہے جس میں ہمیں آگاہی حاصل کرنا ہے تاکہ ایک ابدی عالم کے لئے خود کو آمادہ کر سکیں، دنیا ایک گزر گاہ اور پل ہے جس سے ہمیں عبور کرنا ہے۔

اس صورت میں ہماری دنیوی زندگی بے مقصد اور فضول نہیں ہو گی، بلکہ ایک ایسی ابدی اور جاودا نی زندگی کا مقصد ہو گی جس کے لئے ہم جس قدر کوشش کریں کم ہے۔

جی ہاں معاد کا ایمان انسان کی زندگی کو مفہوم اور معنی بخشاہے اور اسے اختراپ، پریشانی اور بیہودگی سے نجات دلاتا ہے۔ عقیدہ کا انسان کی تربیت میں اہم کردار

اس کے علاوہ آخرت میں ایک عظیم عدالت کے وجود کا عتیقہ ہماری اس زندگی میں غیر معمولی طور پر مؤثر ہے۔

فرض کریں ایک ملک میں یہ اعلان ہو جائے کہ سال کے فلاں دن کسی بھی جرم کی سزا نہیں ہو گی، اس دن کوئی کیس درج نہیں ہو گا اور لوگ کامل اطمینان کے ساتھ اس دن کو کسی سزا کے بغیر گزار سکتے ہیں، اس دن پولیس اور امن و انتظام کے امور میں تعطیل کریں گے، عدالتیں بند ہوں گی، یہاں تک کہ دوسرے دن جب زندگی معمول پر آجائے گی، گزشتہ کل کی جرام کو عدالتیں میں پیش نہیں کیا جائے گا۔

ذراغور کچھے اس دن معاشرہ کی کیا حالت ہو گی؟

قیامت پر ایمان در حقیقت ایک عظیم عدالت پر ایمان ہے جو اس دنیا کی عدالتیں کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے۔

اس عظیم عدالت کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ایک ایسی عدالت ہے، جس میں نہ سفارش چلے گی اور نہ ”ضوابط“ پر ”روابط“ کی حکمرانی ہو گی اور نہ جھوٹے مدارک پیش کر کے اس کے قاضیوں کی سوچ کو تبدیل کیا جاسکے گا۔

۲۔ ایک ایسی عدالت ہے جس میں اس دنیا کی عدالتی کا نہ عدالتی کا روائی نہیں ہو گی اور اسی لئے وہاں پر لمبے اور تفصیلی مرافق مراحل نہیں ہیں، برق آساتھیات کے بعد صحیح اور دقیق حکم جاری کر دیا جاتا ہے۔

۳۔ ایک ایسی عدالت ہے جہاں پر مجرموں کے جرام کے دلائل و مدارک خود ان کے اعمال ہوں گے، یعنی اس عدالت میں خود اعمال حاضر ہو کر گواہی دیں گے، اور مجرم کے ساتھ اپنے ارتبا کو وہ خود اس طرح مشخص کریں گے کہ انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔

۴۔ اس عدالت کے گواہ انسان کے اپنے ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھیں، زبان اور اس کے بدن کی جلد حق جس جگہ پر گناہ یا ثواب انجام دیا ہو گا اس کی زمین اور دردیوار ہوں گے، یہ ایسے گواہ ہیں جو انسان کے اعمال کے فطری آثار کے مانند قابل انکار نہیں ہیں۔

۵۔ اس عدالت کا قاضی اور حاکم خدا ہے، جو ہر چیز سے آگاہ اور بے نیاز اور سب سے بڑا عادل ہے۔

۶۔ اس کے علاوہ اس عدالت کی جزا اس قراردادی نہیں ہیں، اکثر خود ہمارے اعمال ہی مجسم ہو کر ہمارے سامنے ظاہر ہوتے ہیں اور ہمیں اذیت و آزار پہنچاتے ہیں یا ہمیں نعمت و آسانی میں غرق کرتے ہیں۔

اس قسم کی عدالت کا یقین انسان کو ایک ایسی جگہ پر پہنچاتا ہے، جہاں پر وہ علی علیہ السلام کے مانند کہتا ہے:

”خدا کی قسم اگر مجھے نرم بستر کے بجائے راتوں کو صحنِ نکت مہلک کا نٹوں پر جائے ہوئے گزارنا پڑے اور دن کو میرے ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں باندھ کر مجھے گلی اور بازاروں میں گھسیٹا جائے، یہ مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں اللہ کی عدالت میں اس حال میں حاضر کیا جاؤں کہ میں نے کسی بندے پر ظلم کیا ہو یا کسے کا حق غصب کیا ہو۔“ (نُجْ الْبَلَانِمُ، نَطْبَبَهُ: ۲۲۳)

یہ اس عدالت کا ایمان ہے جو انسان (حضرت علی) کو مجبور کرتا ہے کہ وہ آگ میں دہکتا ہو اس رخ لوہا پنے بھائی کے ہاتھ کے قریب لے جائے، جو بیت المال سے اپنے حصہ سے زیادہ کا طالب تھا، جب اس کا بھائی ڈر کے مارے فریاد بلند کرتا ہے، تو اسے نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے: ”تم اس آگ سے ڈرتے ہو جو ایک کھلونے کے مانند انسان کے ہاتھ میں ہے، لیکن اپنے بھائی کو ایک ایسی ہولناک آگ کی طرف ڈھکلیں رہے ہو جسے خدا کے قہر و غصب کے شعلوں نے بھڑکایا ہے؟“ (نُجْ الْبَلَانِمُ، نَطْبَبَهُ: ۲۲۴)

کیا ایسے ایمان رکھنے والے انسان کو دھوکہ دیا جاسکتا ہے؟

کیا رشوت سے اس کے ایمان کو خریدا جاسکتا ہے؟

کیا اسے لمحے اور حکمی سے حق کی راہ سے ظلم کی طرف مخرف کیا جاسکتا ہے؟

قرآن مجید فرماتا ہے: جب گناہ کارا پੈنے اعمال ناموں کو دیکھیں گے تو چیختے ہوئے کہیں گے:

(الْحَمْدُ لِلّٰهِ الرَّبِّ الْعَظِيمِ وَالْكَبِيرِ وَالْأَحَصَابِ) (سورہ کہف، ۳۹)

”ہائے افسوس اس کتاب نے تو چھوٹا بڑا کچھ گناہ نہیں چھوڑا ہے اور سب کو جمع کر لیا ہے۔“

اس طرح ہر کام انجام دیتے وقت انسانی روح کی گہرائیوں میں ذمہ داری کے احساس کی ایک طاقتور موج پیدا ہوتی ہے اور یہی احساس اسے ہر قسم کے انحرافات، گمراہی اور ظلم و زیادتی سے بچاتا ہے۔

#### غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ اگر اس محدود اور ناپائیدار زندگی کے بعد دوسری دنیا نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟

۲۔ معاد کے منکر بعض افراد کیوں خود کشی کا اقدام کرتے ہیں؟

۳۔ قیامت کی عدالت کا اس دنیا کی عدالت سے کیا فرق ہے؟

۴۔ معاد پر ایمان، انسان کے اعمال پر کیا اثر ڈالتا ہے؟

۵۔ امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے اپنے بھائی عقیل سے کیا کہا؟ وہ کیا چاہتے تھے اور علی علیہ السلام نے انھیں کیا جواب دیا؟

## تیسرا سبق

قیامت کی عدالت کا نمونہ خود آپ کے وجود میں ہے

چونکہ موت کے بعد کی زندگی اور قیامت کی عظیم عدالت کا مسئلہ اس محدود دنیا میں مقید انسان کے لئے ایک نئی بات ہے۔ لہذا خد و نب متعال نے اس عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہمارے لئے اسی دنیا میں پیش کیا ہے، جس کا نام ”غمیر (وجدان) کی عدالت“ ہے۔ لیکن یہ بات نہ بھولیں کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ عدالت اس عظیم عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔

اس بات کی بیشتر وضاحت یوں ہے:

انسان، جو بھی اعمالِ انجام دیتا ہے، ان کے سلسلہ میں کئی عدالتوں میں اس کا مقدمہ چلتا ہے:  
پہلی عدالت، تمام کمزیریوں اور نھائص کے باوجود دنیوی اور انسانی عالم عدالت ہے۔  
اگرچہ ان ہی دنیوی عدالتوں کا جرائم کو کم کرنے میں نمایاں اثر ہوتا ہے، لیکن ان عدالتوں کی بنیاد ایسی ہے کہ ان سے مکمل انصاف کے نفاذ کی ہر گز توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔

کیوں کہ اگر ان عدالتوں میں ناقص قوانین اور نالائق حجج کا نفوذ ہو گا تو ان کی حالت معلوم ہے کیا ہو گی! رشوت ستانی، پارٹی بازی: خصوصی روایط، سیاست بازی اور اس قسم کے ہزاروں دوسرے مسائل اس عدالت کو اس قدر متاثر کر دیتے ہیں کہ اس کے ہونے سے نہ ہونا ہی بہتر ہے، کیونکہ ایسی عدالتوں کا وجود خود غرض لوگوں کے برے مقاصد پورے ہونے کا سبب بنتا ہے!

اگر ان عدالتوں کے قوانین عدل و انصاف پر مبنی اور قاضی آگاہ اور باتقویٰ بھی ہوں، تب بھی بہت سے مجرم ایسے ہوتے ہیں جو اس قدر ماہر انہ چال چلتے ہیں۔ کہ جرم کے آثار کو ہی نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔

یاعدالت میں ایسی کاغذ بازی کرتے ہیں اور ایسا داؤں چیخ مارتے ہیں کہ قاضی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر قوانین کو بے اثر کر دیتے ہیں۔  
دوسری عدالت، جو اس عدالت سے منظم اور دقیق تر ہے وہ ”مکافات عمل“ کی عدالت ہے۔

ہمارے اعمال کے کچھ اثرات ہوتے ہیں، جو جلدی یاد یہ رسم سے رونما ہو کر ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ امر مطلق اور عام نہیں ہے، لیکن کم از کم بہت سے موقع پر سچ تاثیرت ہوتا ہے۔

ہم نے ایسی حکومتیں بھی دیکھی ہیں جن کی بنیاد ظلم و ستم پر تھی اور حکام جو چاہتے کرڈا لئے تھے، لیکن سرانجام اپنے ہی پھیلانے گئے جاں میں پھنس گئے

ہیں۔ ان کے اعمال کے رد عمل (اثر) نے انھیں جکڑ لیا اور ایسے زوال سے دوچار کر دیا کہ وہ بالکل نیلے نیسا ہو گئے ہیں اور لعنت و نفرین کے سوال کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا ہے۔ چونکہ مكافات عمل و ہی علت و معلول کے درمیان رابط ہے، اس لئے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو چالاکی سے اس کی گرفت سے فتح نکلیں۔

اس عدالت کا نقص یہ ہے کہ یہ عمومی اور کلی نہیں ہے، اس لئے اس عدالت کے ہوتے ہوئے ہم قیامت کی عظیم عدالت سے بے نیاز نہیں ہیں۔ تیری عدالت، جو اس سے بھی منظم اور دقیق تر ہے، وہ ”ضمیر کی عدالت“ ہے۔

حقیقت میں جس طرح نظام شمسی ایک عظیم اور حریت اگنیز نظام کے باوجود ایتم کی ایک انتہائی چھوٹے ذرہ کے اندر سمٹا ہوا ہے، اسی طرح قیامت کی عظیم عدالت کا ایک چھوٹا سا ماذل ہماری روح میں پایا جاتا ہے۔

انسان کے وجود کے اندر ایک مرموٹ طاقت ہے، جسے فلاسفہ نے ”عقل عملی“ کا نام دیا ہے اور قرآن مجید کی اصطلاح میں اسے ”نفس لواحہ“ کہا جاتا ہے اور آج اسے ”وجدان“ اور ”ضمیر“ کے نام سے جانتے ہیں۔

جوں ہی انسان کسی ابھی یا برے کام کو انجام دیتا ہے، فوراً یہ عدالت کسی شور و غل کے بغیر تشکیل پاتی ہے، اور کامل طور پر صحیح اور اصولوں پر مبنی محکم شروع کرتی ہے اور حکم کے نتیجے کو فیضی سزا یا جزا کی صورت میں نافذ کرتی ہے۔

یہ عدالت کبھی مجرموں کو اندر سے ہی ایسے کوڑے مار کر وحی افیت پہنچاتی ہے کہ وہ دل سے موت کا استقبال کرتے ہیں اور اسے زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں کہ ہم نے ضمیر کے اضطراب کی وجہ سے خود کشی کی ہے!

کبھی انسان کے ایک نیک کام انجام دینے کے نتیجہ میں اس قدر اس کی اہمیت افسرائی کرتے ہے کہ اس میں وجد و سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ اپنے وجود میں ایک گھر اسکون محسوس کرتا ہے، دل کو لبھانے والا ایک ایسا اسکون، جس کی لذت قابل بیان نہیں ہوتی ہے۔

اس عدالت کی عجیب خصوصیات ہیں:

۱۔ اس عدالت میں قاضی، شاہد، حکم نافذ کرنے والا اور عدالت کی کاروائی دیکھنے والا سب ایک ہی ہے، وہی ضمیر کی طاقت ہے جو شہادت بھی دیتی ہے، فیصلہ بھی کرتی ہے اور اس کے بعد آستین چڑھا کر اپنے حکم کو نافذ بھی کرتی ہے!

۲۔ اس عدالت کا فیصلہ عام عدالتوں کے برخلاف (کہ جن میں کیس کوئی سال لگتے ہیں) فوری ہوتا ہے، عام طور پر اس میں وقت نہیں لگتا ہے، البتہ کبھی جرم کے دلائل ثابت ہونے اور دل کی آنکھوں کے سامنے سے غفلت کے پردے ہٹنے میں وقت کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن دلائل پیش ہونے کے بعد، حکم فوری اور قطعی طور پر سناد یا جاتا ہے۔

۳۔ اس عدالت کا حکم ایک ہی مرحلہ میں انجام پاتا ہے، یہاں پر اپیل، نظر ثانی اور سپریم کورٹ جیسی چیزوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

۴۔ یہ عدالت صرف سزاکیں نہیں دیتی ہے بلکہ فرائض انجام دینے والوں کو جزا بھی دیتی ہے۔ اس لئے یہ ایک ایسی عدالت ہے جس میں نیک و بد دونوں کے کیس کی تحقیق و شنوائی ہوتی ہے اور ان کے اعمال کے تناسب سے انھیں سزا یا جزا ملتی ہے۔

۵۔ اس عدالت کی سزاویں کی دنیا کی عام عدالتوں کی سزاویں سے کوئی شاہت نہیں ہے۔ ظاہر نہ کوئی زمان ہے، نہ کوڑے، نہ تختہ دار اور نہ گولیوں کی مار، لیکن اس عدالت کا حکم مجرم کو اندر سے ایسا جلاتا ہے اور جیل میں ڈال دیتا ہے کہ اس کے لئے دنیا پنی تمام و سعتوں کے باوجود تگ ہو جاتی ہے ایسی کہ

ایک جیل کی خوفناک اور تنگ و تاریک کال کو ٹھری سے بھی زیادہ تنگ ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ عدالت اس دنیا کی عدالتوں کی جیسی نہیں ہے بلکہ قیامت کی عدالت کے مانند ہے۔

اس عدالت کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید نے اس کی قسم کھائی ہے اور اسے قیامت کی عدالت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے سورہ قیامت کی آیت نمبر ۲۳ سے ۲۷ تک ارشاد فرماتا ہے:

(لَا قُلْمِبُومُ الْقِيمَةِ. وَلَا قُلْمِبُ الْلَّوَامَةِ. أَيْحَسِبُ إِلَّا إِنْسَانٌ إِنَّمَا نَجْعَلُ عَظَمَاتَهُ بِلِيٰ قَادِرِينَ عَلَى إِنْتَسَابِ بَنَاهُ )

”میں روز قیامت کی قسم کھاتا ہوں اور برائیوں پر ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں۔ کیا یہ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ یقیناً ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کے پورستک درست کر سکیں۔“

لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود ضمیر کی عدالت دنیوی ہونے کی وجہ سے کچھ ناقص رکھتی ہے، جس کی وجہ سے یہ ہمیں قیامت کی عدالت سے بے نیاز نہیں کر سکتی ہے۔ کیونکہ:

۱۔ ضمیر کے حدود کے دائے میں تمام چیزیں نہیں آسکتی ہیں کیونکہ ضمیر کے حدود انسان کی فکر و تشنیع کے قلمرو کے مطابق ہوتے ہیں۔

۲۔ کبھی ایک ماہر دھوکہ بازاور چالباز انسان اپنے ضمیر کو بھی دھوکہ دے سکتا ہے یعنی اپنے ضمیر کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک سکتا ہے۔

۳۔ کبھی بعض گناہگاروں کے ضمیر کی آواز اس قدر کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔

امذا چو تھی عدالت یعنی قیامت کی عظیم عدالت کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ حقیقت میں انسان کا محکم کتنی عدالتوں میں ہوتا ہے؟
- ۲۔ پہلی عدالت کا نام اور اس کی خصوصیات بیان کیجئے۔
- ۳۔ دوسری عدالت کی خصوصیات کیا ہیں؟
- ۴۔ تیسرا عدالت کی خصوصیات کیا ہیں؟
- ۵۔ ضمیر کی عدالت کی خصوصیات اور ناقص بیان کیجئے۔

## چوتھا سبق

معاد، فطرت کی جلوہ گاہ میں

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا کی معرفت انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اگر ہم ایک انسان کے آگاہ اور نا آگاہ ضمیر پر تحقیق و جستجو کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ وہ ایک ایسے ماورائے طبیعت خالق پر ایمان رکھتا ہے جس نے علم، منصوبہ اور مقصد کے مطابق اس کائنات کو پیدا کیا ہے۔

لیکن یہ مسئلہ ”توحید و خداشناسی“ تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ دین کے تمام بنیادی اصول اور فروع انسان کی فطرت کے اندر ہونے چاہئے، اگر ایسا نہ ہو تو ”تشریعی“ اور ”تکونی“ احکام کے درمیان ضروری ہم آہنگی حاصل نہیں ہو گی۔ (تو جہ فرمائیے) اگر ہم اپنے دل پر ایک نگاہ ڈالیں اور اپنی روح و جان کی گہرائیوں میں اتر کر جستجو اور تحقیق کریں، تو ہم اپنے دل کے کانون سے یہ گنگناہٹ سنیں گے کہ

زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی ہے، بلکہ موت عالم بقاء کی طرف کھلنے والا ایک دریچہ ہے!

اس حقیقت کو ماننے کے لئے ہمیں مندرجہ ذیل نکات پر توجہ کرنی چاہئے:

### ۱۔ بقاء کا عشق

اگر انسان کو واقعہ اور نابودی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، تو اسے فنا اور نابودی کا عاشق ہونا چاہئے، اور اپنی عمر کے آخر میں موت سے لذت حاصل کرنی چاہئے۔ لیکن ہم اس کے بر عکس دیکھتے ہیں کہ انسان کے لئے موت کا چہرہ (نابودی کے معنی میں) کسی بھی زمانہ میں نہ صرف خوشنگوار نہیں ہے بلکہ وہ ہر ممکن صورت میں اس سے بھاگتا ہے۔

ہمارا بقاء کے ساتھ یہ عشق بتاتا ہے کہ ہم بقاء کے لئے خلق کئے گئے ہیں، اور اگر ہم فنا کے لئے پیدا کئے گئے ہوتے تو اس عشق و محبت کے کوئی معنی نہیں تھے۔

ہمارے اندر پائے جانے والے تمام بنیادی عشق ہمارے وجود کو مکمل کرتے ہیں، بقاء کے ساتھ ہمارا عشق بھی ہمارے وجود کو مکمل کرنے والا ہے۔ یہ نہ بھولئے کہ ہم نے ”معاد“ کی بحث کو خداوند حکیم و علیم کے وجود کو قبول کرنے کے بعد شروع کیا ہے، ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ نے جو کچھ ہمارے وجود میں خلق کیا ہے وہ حساب و کتاب کے مطابق ہے، اس لحاظ سے انسان کا بقاء کے ساتھ عشق کا بھی کوئی حساب و کتاب ہونا چاہئے اور وہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا کے وجود کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہو سکتا۔

### ۲۔ گرشته اقوام میں قیامت کا عقیدہ

تاریخ بشر جس طرح گواہی دیتی ہے کہ زمانہ قدیم سے گرشته اقوام میں کلی طور پر مذہب کا وجود تھا، اسی طرح قدیم ترین زمانہ سے انسان کے ”موت کے بعد والی زندگی“ کے بارے میں راخن عقیدہ کی بھی گواہی دیتی ہے۔

قدیمی تھی، قبل تاریخ کے انسانوں کے بارے میں ملنے والے آثار، بالخصوص قبور کی تعمیر اور مردوں کو دفن کرنے کے طریقے اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ وہ موت کے بعد والی زندگی پر ایمان رکھتے تھے۔

انسان میں ہمیشہ سے پائے جانے والے اس بنیادی عقیدہ کو محض ایک معمولی مسئلہ نہیں سمجھا جاسکتا ہے یا اسے ایک عادت یا تلقین کا نتیجہ تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

جب بھی ہم انسانی معاشروں میں پوری تاریخ کے دوران مستحکم بنیادوں پر مبنی کسی عقیدہ کو پائیں تو ہمیں اسے فطری ہونے کی علامت سمجھنا چاہئے، کیونکہ یہ صرف فطرت ہی ہے جو زمانہ حوادث اور اجتماعی و فکری تبدیلیوں کا مقابلہ کر سکتی ہے اور ثابت قدم رہ سکتی ہے، ورنہ عادات، رسومات اور تلقینیں زمانہ کے گزرنے کے ساتھ فراموش ہو جاتی ہیں۔

کسی خاص لباس کا پہننا ایک عادت یا آداب و رسوم کا حصہ ہے، لہذا حالات کے بدلنے یا زمانہ کے گزرنے سے اس میں تبدیلی آجائی ہے۔ لیکن بیٹھ کی نسبت مال کی محبت ایک غریزہ اور فطرت ہے، لہذا ماحول اور حالات کی تبدیلی اس کے شعلے کو خاموش کر سکتی ہے اور نہ زمانہ کے گزرنے کی وجہ سے اس پر گرد و غبار پڑ سکتا ہے۔ اس طرح کی ہر کشش پیدا ہونے کی صورت میں جانتا چاہئے کہ یہ انسان کی فطرت کی دلیل ہے۔، جب دانشور

کہتے ہیں: ”دقیق تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے ابتدائی اقوام بھی کسی نہ کسی مذہب کے پیروتھے... کیونکہ وہ اپنے مردوں کو ایک خاص طریقے پر دفن کرتے تھے اور ان کے کام کرنے کے آلات وسائل کو ان کے ساتھ رکھتے تھے، اور اس طرح دوسری دنیا (آخرت) کے وجود پر اپنے عقیدہ کو ثابت کرتے تھے (۱)۔“

تو ہمیں بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقوام موت کے بعد والی زندگی کا عقیدہ رکھتے تھے، اگرچہ وہ اس سلسلہ میں غلط راہ پر چلتے تھے اور یہ تصور کرتے تھے کہ موت کے بعد والی زندگی بھی اس دنیوی زندگی کے مشابہ ہے، اس لئے اس دنیا کے آلات اور ساز و سامان کی وہاں بھی ضرورت پڑے گی۔

۳۔ معاد کے فطری ہونے کی ایک اور دلیل انسان کے اندر وجدان و ضمیر کی عدالت کا وجود ہے۔

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی بیان کیا کہ ہم سب بخوبی احساں کرتے ہیں کہ ہماری یہ اندر وینی عدالت ہمارے اعمال کی تقییش کرتی ہے، نیکیوں کے مقابلہ میں جزا دیتی ہے جس کے نتیجہ میں ہم ایسا آرام اور سکون کا احساس کرتے ہیں کہ ہماری روح نشاط و شادی کی ایک ایسی لذت محسوس کرتی ہے، جس کی توصیف سے زبان اور قلم عاجز ہیں۔ اور بُرے کاموں بالخصوص گناہوں کیمیرہ کے مقابلہ میں ایسی سزا دیتی ہے جو انسان کے لئے زندگی کو تلخ بنادیتی ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد نے ایک بڑے ظلم و جرم جیسے قتل کے ارتکاب کے بعد عدالت سے فرار کرنے کے بعد رضا کارانہ طور پر خود کو عدالت میں پیش کیا ہے اور جرم کا اعتراف کرنے کے بعد پھانسی کے بچندے کا استقبال کیا ہے اور اس کی وجہ ضمیر کے شکنجه اور روحی عذاب سے نجات حاصل کرنا بتایا ہے۔

اس باطنی وروحی عدالت کا مشاہدہ کرنے کے بعد انسان اپنے آپ سے یہ

۱۔ جامعہ شناسی ”کینگ“، ص ۱۹۲

سوال کرتا ہے: یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک چھوٹا و جو درکھنے کے باوجود میرے اندر ایک ایسی عدالت موجود ہو، لیکن اس عظیم کائنات کی کوئی عدالت نہ ہو؟!

اس لئے معاد کے عقیدہ اور موت کے بعد زندگی کے فطری ہونے کو درج ذیل تین را ہوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے:

۱۔ بقاء کا عشق۔

۲۔ پوری تاریخ بشریت میں اس ایمان اور عقیدہ کا وجود۔

۳۔ انسان کی روح کے اندر اس کے ایک چھوٹے سے نمونہ کا وجود۔

## غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ غیر فطری امور کو فطری امور سے کیسے جدا کیا جاسکتا ہے؟
- ۲۔ انسان کی بقاء سے عشق رکھنے کی دلیل کیا ہے؟ اور یہ بقاء کا عشق کیسے معاد کے فطری ہونے کی دلیل بن سکتا ہے؟
- ۳۔ کیا گزشتہ اقوام بھی معاد کا عقیدہ رکھتے تھے؟
- ۴۔ ہمارے ضمیر کی عدالت کیسے ہمیں جزا یا سزا دیتی ہے؟ اس کی دلیل اور کچھ نمونے بیان کیجئے۔
- ۵۔ ضمیر کی عدالت اور قیامت کی عظیم عدالت کے درمیان کیا ربط ہے؟

پانچواں سبق:

قیامت، انصاف کی ترازو میں

کائنات کے نظام اور خلقت کے قوانین پر تھوڑا سا غور کرنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ قانون کی حکمرانی ہے اور ہر چیز اپنی جگہ پر برقرار ہے۔ یہ عادلانہ نظام، انسان کے بدن میں اس قدر باریکی کے ساتھ قائم ہے کہ اس میں چھوٹی سی تبدیلی اور ناہم آہنگی بیماری یا موت کا سبب بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر آنکھ، دل اور مغز کی بناوٹ میں ہر چیز اپنی جگہ پر ہے اور ضروری حد تک یہ عدالت اور نظم نہ صرف انسان کے بدن میں موجود ہے بلکہ تمام کائنات پر حکم فرماتے ہیں، جیسا کہ قرآن نے کہا ہے:

”بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ“

”عدل کے ذریعہ آسمان اور زمین قائم ہیں“

ایک ایتم اس قدر چھوٹا ہے کہ دسیوں لاکھ ایتم ایک سوئی کی نوک میں سما سکتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ اس ایتم کی بناوٹ کس قدر دقیق اور منظم ہونی چاہئے کہ کروڑوں سال سے اپنی اس حالت کو قائم رکھتا ہے۔ یہ الکترونی اور یروٹو نوں کے دقيق نظام میں غیر معمولی توازن و تعادل کی وجہ سے ہے اور کوئی بھی بڑایا چھوٹا سٹم اس حیرت انگیز نظام سے باہر نہیں ہے۔

کیا واقعاً انسان ایک استثنائی مخلوق ہے؟ اس عظیم کائنات کے لئے ایک ناموزون اور ناظم جزء اور ایک بے جوڑ پیوند ہے کہ اسے آزاد رہنا چاہئے اور جس بے نظمی، ظلم اور بے انسانی کو چاہے، اس کا مرتكب ہو جائے؟ یا یہاں پر ایک راز مضمرا ہے؟ اختیار اور ارادہ کی آزادی

حقیقت میں انسان کائنات کی تمام مخلوقات سے ایک بنیادی تقاضہ رکھتا ہے اور وہ اس کا ”اختیار اور ارادہ کی آزادی“ رکھنا ہے۔

خداوند متعال نے انسان کو کیوں آزاد خلق کیا ہے اور فیصلہ کرنے کا حق اسے بخشتا ہے تاکہ جو چاہے انجام دے؟

اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ آزاد نہ ہوتا تو وہ کمال حاصل نہیں کر سکتا تھا اور یہ عظیم امتیاز انسان کے معنوی و اخلاقی کمال کا ضامن ہے۔ مثلاً اگر کسی کو نیزے کی نوک پر مستضعفین کی مدد کرنے اور معاشرے کی بھلائی کے کام انجام دینے پر مجبور کیا جائے، تو بہر صورت یہ نیک کام انجام پا سکتا ہے، لیکن مدد کرنے والے کے لئے کسی قسم کے اخلاقی و انسانی کمال کا سبب نہیں بن سکتا ہے، حالانکہ اگر وہ اپنی مرضی اور ارادہ سے اس کا ایک فی صد حصہ بھی دیدے تو اسی قدر اس نے اخلاقی و معنوی کمال کی راہ پر قدم بڑھایا ہے۔

اس لئے معنوی و اخلاقی کمال حاصل کرنے کی پہلی شرط ”اختیار اور ارادہ کی آزادی“ ہے تاکہ انسان اپنی مرضی سے اس راہ کو طے کرے نہ کہ عالم طبیعت کے اضطراری عوامل کی طرح مجبوری کی حالت میں۔ خداوند متعال نے انسان کو یہ نعمت اسی بلند مقصد کے لئے عطا کی ہے۔

لیکن یہ نعمت اس پھول کے مانند ہے جس کے ارد گرد کانٹے بھی اگے ہوتے ہیں، اور یہ کانٹوں کا آننا انسان کا اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ظلم و ستم اور گناہ کا مرتكب و آلوہہ ہونا ہے۔

البتہ خداوند متعال کے لئے اس میں کوئی مشکل نہیں تھی کہ اگر انسان ظلم و ستم کا مرتكب ہوتا تو فوراً اس پر ایک ایسا عذاب نازل کرتا کہ پھر ایسا کبھی سوچتا بھی نہیں، مثلاً اس کے ہاتھ پلچھے ہو جاتے، آنکھیں اندر ٹھی ہو جاتیں اور زبان بے کار ہو جاتی۔

صحیح ہے کہ ایسی صورت میں کوئی شخص آزادی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاتا اور گناہ کے پیچھے نہ جاتا، لیکن حقیقت میں یہ پہیز گاری اور تقویٰ کا جبری پہلو ہوتا، اور

انسان کے لئے کوئی فضیلت نہیں ہوتی بلکہ یہ شدید، فوری اور بلا فاصلہ سزا سے ڈرنے کے سبب ہوتا۔ لہذا، انسان کو ہر حالت میں آزاد ہونا چاہئے، اور پروردگار عالم کے گوناگوں امتحات کے لئے آمادہ ہونا چاہئے، اور استثنائی موقع کے علاوہ فوری سزاوں سے محفوظ رہنا چاہئے تاکہ اپنی وجودی قدر و منزلت کا مظاہرہ کر سکے۔ لیکن یہاں پر ایک مطلب باقی رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے: اگر بھی حالت برقرار رہے اور ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق راستہ کا انتخاب کرے، تو کائنات پر حکم فرما خدا کے قانون عدالت کی خلاف ورزی ہو گی۔ یہاں پر ہمیں یقین پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے لئے ایک عدالت معین ہوئی ہے، جس میں بلا استناس ب لوگ حاضر کئے جائیں تاکہ اپنے اعمال کی جزا پائیں اور عالم خلقت کی عمومی عدالت سے اپنا حصہ وصول کریں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ وقت کے نزد، فرعون، چنگیز اور قارون ایک عمر ظلم و ستم کرتے رہیں اور ان کے لئے کسی قسم کا حساب و کتاب نہ ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ مجرم اور پرہیز گار دونوں کو پروردگار کی عدالت کی ترازو کے ایک ہی پلس میں رکھا جائے؟ قرآن مجید اس سلسلہ میں سورہ قلم کی آیت نمبر ۳۵ میں فرماتا ہے:

(۱) نَجِعَ الْمُسْلِمِينَ كَالْجَرِ مِنْ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْمُلُونَ (۲)

”کیا ہم اطاعت گزاروں کو مجرموں جیسا بنادیں۔ تمہیں کیا ہو گیا کیسا فیصلہ کر رہے ہو؟“

ایک اور جگہ پر سورہ ص کی آیت نمبر ۲۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

(۳) اَمْ نَجِعَ الْمُتَقِينَ كَالْفَجَارِ (۴)

”کیا ہم صاحبان تقویٰ کو فاسق و فاجر افراد جیسا قرار دے دیں؟“

صحیح ہے کہ بعض گناہ کار اسی دنیا میں اپنے برے اعمال کی سزا پاتے ہیں یا اس سزا کے ایک حصہ کو پاتے ہیں۔ صحیح ہے کہ ضمیر کی عدالت ایک اہم مسئلہ ہے۔

اور یہ بھی درست ہے کہ بعض اوقات گناہ اور ظلم و ستم کے رد عمل اور بے انسانی کے برے متاثر انسان کو اپنے پیجوں میں جکڑ لیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم درست اور دقت سے غور کریں تو معلوم ہو گا کہ مذکورہ تین امور میں سے کوئی ایک بھی عام نہیں تاکہ ہر ظالم و گناہ کار کو اس کے ظلم اور گناہ کے برابر سزا دے۔ اور بہت سے ایسے لوگ ہیں جو مكافات عمل کے چنگل، ضمیر کی سزا اور اپنے برے اعمال کے رد عمل سے فرار کر جاتے ہیں یا کافی حد تک سزا نہیں پاتے۔

ایسے افراد اور عام لوگوں کے لئے عدل و انصاف کی ایک عدالت کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہاں پر ذرہ برابر بھی نیک اور برے کام کا محاسبہ ہو، اگر ایسا نہ ہو گا تو اصلاً عدل و انصاف حاصل نہیں ہو گا۔

لہذا ”پروردگار کے وجود“ اور ”اس کے عدل“ کو قبول کرنا ”قیامت“ اور ”دوسری دنیا“ کے قبول کرنے کے برابر ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے جزو لا یقین ہیں۔

## غور کچھ اور جواب دیجئے

- ۱۔ آسمان اور زمین عدل کے ذریعہ کیسے قائم ہیں؟
- ۲۔ انسان کو ”اختیار و ارادہ“ کی آزادی کی نعمت سے کیوں نوازا گیا ہے؟
- ۳۔ اگر کنہا گاراسی دنیا میں فوری طور پر اپنے اعمال کی شدید سزا پاتے تو کیا ہوتا؟
- ۴۔ مکافات عمل، ضمیر کی عدالت اور ہمارے اعمال کے رد عمل ہمیں قیامت کی عدالت سے کیوں بے نیاز نہیں کرتے؟
- ۵۔ ”عدل الٰہی“ اور ”معاد“ کے مسئلہ کے درمیان کیا رابطہ ہے؟

## چھٹا سبق

معاد کا اسی دنیا میں مشاہدہ

قرآن مجید کی آیات اس حقیقت کو بخوبی بیان کرتی ہیں کہ بت پرست اور تمام کفار نہ صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بلکہ دوسرے زمانوں اور عصروں میں بھی معاد اور موت کے بعد زندہ ہونے کے مسئلہ پر تجربہ اور وحشت کا اظہار کرتے تھے، حتیٰ اس قسم کا اعتقاد رکھنے والوں کو دیوانہ شمار کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہتے تھے :

... ) حَلَّ نَدْكُمْ عَلَى رَجُلٍ بِنْبَكْمٍ إِذَا مَرَّ قَمْ كُلْمَ لِغْيٍ خَلَقَ جَدِيدًا فَتَرَى عَلَى السَّكَنِ بَأْمَ بِجَنَّةِ... ) ( سہہ ۷۔ ۸ )  
”کیا ان کا کہنا ہے کہ ہم تھیں ایسے آدمی کا پتہ بتائیں گے جو یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم مرنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ گے تو تھیں نئی خلقت کے بھیں میں لا یا جائے گا۔ اس نے اللہ پر جھوٹا لزام باندھا ہے یا اس میں جنون پایا جاتا ہے۔“

جی ہاں، اس روز لا علیٰ جہالت اور تنگ نظری کے سبب، موت کے بعد والی دنیا اور مردوں کے زندہ ہونے کے عقیدہ کو ایک قسم کی دیوالی یا خدا پر تہمت شمار کیا جاتا تھا۔ اور بے روح مادہ (مرنے کے بعد خاک میں ملے جسم) سے چشمہ حیات کے جاری ہونے کے عقیدہ کو دیوالی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس قسم کے افکار کے مقابلہ میں مختلف دلائل پیش کی ہیں، کہ ان سے عام لوگوں کے علاوہ بڑے دانشور اور مفکرین بھی اپنی فکری صلاحیتوں کے مطابق استفادہ کر سکتے ہیں۔

اگرچہ قرآن مجید کی ان دلائل کی تشریح کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب تالیف کرنے کی ضرورت ہے، لیکن ہم یہاں پر ان کے چند نمونے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ کبھی قرآن مجید ان سے کہتا ہے کہ تم لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں اپنی آنکھوں سے ہمیشہ معاد کے مناظر کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کس طرح بعض مخلوقات مرتی ہیں اور پھر زندہ ہوتی ہیں، کیا اس کے باوجود بھی تم لوگ معاد کے مسئلہ میں شک و شبہ کرتے ہو؟!  
(والسالنَّى ارْسَلَ الرَّسُّوْلَ فَتَسَرَّعَ سَهْلًا بِعَقْنَهِ الْبَلْدَ مِنْتَهَى الْأَرْضِ بَعْدَ مُوْتَهُ كَلْكَالَ النَّسْوَرِ )  
(سورہ فاطر، ۹)

”اللہ ہی وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھجا تو وہ بادلوں کو منتشر کرتی ہیں اور پھر ہم انھیں مردہ شہر تک لے جاتے ہیں اور زمین کے مردہ ہو جانے کے بعد اسے زندہ کر دیتے ہیں، اسی طرح مردے دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔“

موسم سرما میں جب ہم طبیعت کے چہرہ پر ایک نگاہ ڈالنے لئے ہیں تو ہمیں ہر سو موت کے آثار نظر آتے ہیں، درخت پتوں، پھولوں اور میوؤں سے خالی پڑے

ہیں اور خشک کٹری بن کر اپنی جگہوں پر بے حرکت کھڑے ہیں، نہ کوئی پھول مسکراتا ہے اور نہ کوئی کھلتی دکھائی دیتی ہے اور نہ پہاڑوں اور صحرائوں میں کہیں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔

جب بہار کا موسم آتا ہے، ہوا ملائم ہوتی ہے، بارش کے حیات بخش قطرات بر سے لگتے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے پوری طبیعت میں ایک حرکت نمایاں ہو جاتی ہے: سبزے اور پودے اگنے لگتے ہیں، درختوں پر پتے لکل آتے ہیں، کلیاں اور پھول کھل اٹھتے ہیں، پرندے درختوں کی ٹہینیوں پر بیٹھ کر چھپھانے لگتے ہیں اور ”محشر“ کا شور پاہو جاتا ہے۔

اگر موت کے بعد زندگی کے کوئی معنی نہ ہوتے تو ہم ہر سال اپنی آنکھوں کے سامنے ان مناظر کا مشاہدہ نہیں کرتے، اگر موت کے بعد زندگی ایک ناممکن امر اور دیوالگی کی بات ہوتی تو، ہماری آنکھوں کے سامنے اس طرح محسوس صورت میں اس کی ہر گز تکرار نہ ہوتی۔ آخر زمین کے مرنے کے بعد زندہ ہونے اور انسان کے مرنے کے بعد زندہ نے میں کیا فرق ہے؟

۲۔ کبھی قرآن مجید ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں ابتدائی خلقت کی طرف لے جاتا ہے، ابتدائی خلقت کی یاد ہانی کرتا ہے، اس صحرائی مرد کی داستان کی طرف اشارہ کرتا ہے جو سڑی گلی ایک ہڈی کا ٹکڑا لے کر پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آگیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا: ”اے محمد! کون اس سڑی ہوئی ہڈی کو پھر سے زندہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ مجھے بتا دو کہ کون یہ کام انجام دے سکتا ہے؟“ وہ گمان کر رہا تھا کہ مسئلہ معاد کے خلاف ایک دنداں شکن دلیل لے آیا ہے۔ لیکن قرآن مجید نے پیغمبر اسلامؐ کو یہ فرمانے کا حکم دیا:

(قلْ تَحْيِهَا الَّذِي أَنْشَأَاهُولَ مَرْءَةً) (سورہ یس، ۷۹)

”آپ کہہ دیجئے کہ جس نے پہلی مرتبہ (بے جان مادہ سے) خلق کیا ہے وہی (پھر سے) زندہ کرے گا“  
ابتدائی خلقت اور دوبارہ پیدا کرنے میں کیا فرق ہے؟

امداد و سری آیات میں ایک بالکل مختصر لیکن با معنی جملہ میں فرماتا ہے:  
(کما بداتا اول خلق لغید) (سورہ نساء، ۱۰۳)

”جس طرح ہم نے شروع میں خلق کیا اسی طرح پھر لوٹا دیں گے۔“

۳۔ کبھی قرآن مجید و سبع زمین و آسمان کی خلقت کے بارے میں خداوند متعال کی عظیم قدرت کی یاد ہانی کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:  
(اویس الذی خلق السموات والارض بقدر علی ان يخلق مثلهم بلى و هو الخلق العلیم ۰ انما امرہ اذا راد شيئا ان یقول له کن فیکون ۰) سورہ یس، ۸۱-۸۲  
”تو کیا جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کا مثل دوبارہ پیدا کر دے۔ یقیناً ہے اور وہ بہترین پیدا کرنے والا اور جانے والا ہے۔ اس کا امر صرف یہ ہے کہ کسی شے کے بارے میں یہ کہنے کا ارادہ کر لے کہ ہو جاتو ہے فوراً ہو جاتی ہے۔“

ان مسائل میں شک و شبہ کرنے والے، ایسے افراد تھے جن کی فکر کی فضائل کے چھوٹے سے گھر کی چار دیواری سے زیادہ نہیں تھی، ورنہ وہ جانتے تھے کہ دوبارہ زندہ کرنا ابتدائی خلقت سے آسان اور سادہ تر ہے اور آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے خدا کی قدرت کے مقابلہ میں مردوں کو زندہ کرنا کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔

۴۔ قرآن مجید کبھی موت کے بعد زندہ کرنے کی پروردگار کی ”طاقتوں“ کو ان کی نظر وں میں منعکس کر کے فرماتا ہے:

(اللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَشْجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِّنْهُ تَوَدُونَ) (سورة آیہ ۸۰)

”اس نے تمہارے لئے ہرے درخت سے آگ پیدا کر دی ہے تو تم اس سے ساری آگ روشن کرتے رہے۔“

یعنی جو خدا ہرے درخت سے آگ پیدا کر سکتا ہے وہ انسانوں کو مرنے کے بعد زندہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔

جب ہم قرآن مجید کی اس عجیب و غریب تعبیر پر وقت سے غور کرتے ہیں اور جدید سائنس سے مدد لیتے ہیں تو سائنس ہمیں بتاتی ہے: جب ہم کسی درخت کی لکڑی کو جلاتے ہیں تو اس سے جو آگ نکلتی ہے، یہ وہی سورج کی گری اور نور ہے جو سالہا سال سے طاقت (انرجی) کی صورت میں درخت میں درخت میں ذخیرہ ہوئی ہے۔ ہم خیال کرتے تھے وہ نور اور حرارت نایود ہو چکی ہے، لیکن آج دیکھتے ہیں کہ دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں اور حیات کا لباس نوزیب تن کرنے لئے ہیں۔

کیا اس خدا کے لئے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا مشکل امر ہے، جو یہ قدرت رکھتا ہے کہ دسیوں سال تک آنفاب کے نور و حرارت کو ایک درخت کے جسم میں زخیرہ کرے اور ایک لمحہ میں اس حرارت اور نور کو درخت سے باہر لے آئے (۱)؟

بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے کیسی متدل اور واضح منطق سے ان لوگوں کا دندان شکن جواب دیکھ معاد کے ممکن ہونے کو واضح طور پر ثابت کر دیا ہے، جو مسئلہ میں شک و شبہ ایجاد کرتے تھے اور حتیٰ کہ معاد کا اعتقاد رکھنے والوں کو دیوانہ کہتے تھے۔

۱۔ قابل غور بات ہے کہ سائنس (علم نباتات) نے ثابت کیا ہے کہ ہرے درخت سورج کی روشنی سے کاربن ڈائی اوسائٹ گیس کو جذب کر کے اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور کاربن کو اپنے اندر ذخیرہ کرتے ہیں اور اوس کو چھوڑ دیتے ہیں اس کے علاوہ سورج کی توانائی (انرجی) کو بھی اپنے اندر ذخیرہ کرتے ہیں۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۲۔ مسئلہ معاد سے مشرکین کیوں تعجب کرتے تھے؟

- ۲۔ معاد کے منظر کو ہم کیسے ہر سال پودوں میں مشاہدہ کرتے ہیں؟
- ۳۔ قرآن مجید نے اپنی بعض آیت میں جنین کے دوران کو معاد کی ایک نشانی تباہی ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟
- ۴۔ تو انہیوں (انرجیوں) کا دوبارہ زندہ ہونا کیا ہے؟
- ۵۔ قرآن مجید نے کیوں ”الشجر الاتخڑ“ (ہرے درخت) سے استدلال کیا ہے؟

## ساتوال سبق

معاد اور تخلیق کا فلسفہ

بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ خداوند متعال نے ہمیں کس لئے پیدا کیا ہے؟  
باغبان درخت کو بچل کے لئے لگاتا ہے، کسان فصل کاٹنے کے لئے زمین کو کھود کر اس میں کیاریاں بناتا ہے اور بیج بوتا ہے۔ آخر خالق کے باغبان نے  
ہمیں کس لئے پیدا کیا ہے؟

کیا خداوند متعال کو کسی چیز کی کمی تھی، جس کی تلافسی کے لئے ہمیں خلق کیا ہے؟ اس صورت میں تو خدا کو محتاج ہونا پڑے گا اور پروردگار کے لئے محتاج ہونا  
اس کی ذات اور اس کے لامحدود وجود کے شایان شان نہیں ہے۔  
ذکر وہ سوالات کا جواب مفصل ہے لیکن ان کے جواب چند جملوں میں خلاصہ کر کے واضح کیا جاسکتا ہے:  
ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم خداوند متعال کی صفات کا اپنی ذات سے موازنہ کرتے ہیں، چونکہ ہم ایک محدود مخلوق ہیں، اس لئے جو بھی کام  
انجام دیتے ہیں، اپنی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے، ہم سبق پڑھتے ہیں تاکہ اپنی علمی کمی کو پورا کریں، کام کرتے ہیں تاکہ اپنی مال کی پورا کریں۔ علاج و

معالجہ کے پیچھے دوڑتے ہیں تاکہ صحت و سلامتی حاصل کریں۔

لیکن خداوند متعال، جو ہر لحاظ سے ایک لا محدود وجود ہے، اگر کوئی کام انجام دے تو ہمیں اس کے مقصد کو اس کے وجود سے باہر جتباور تلاش کرنی چاہئے، وہ اس لئے کسی کو پیدا نہیں کرتا ہے تاکہ خود اسے کوئی فائدہ ملے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ”اپنے بندوں کو نعمتوں سے نوازے“۔

وہ ایک پر نور اور لا محدود سورج ہے، جو کسی احتیاج کے بغیر اپنا نور پھیلاتا ہے تاکہ سب اس کے وجود سے مستفید ہوں۔ یہ اس کی لا محدود اور پر برکت پر فیض ذات کا تقاضا ہے کہ تمام مخلوقات کا ہاتھ بکڑ کر انھیں کمال کے راستہ پر گام زن کرتا ہے۔

ہماری خلقت اپنے عدم سے کمال کی طرف ایک برجستہ قدم تھا خدا کی طرف سے انبیاء کا بھیجا، آسمانی کتابوں کا نزول اور قوانین و احکام کا صیغہ ہونا، ہر ایک ہمارے کمال کے مراحل شمار ہوتے ہیں۔

یہ دنیا ایک عظیم یونیورسٹی ہے اور ہم اس کے طالب علم ہیں (۱)۔

یہ دنیا ایک آمادہ کھیت ہے اور ہم اس کے کسان ہیں (۲)۔

یہ دنیا ایک فائدہ بخش تجارتی مرکز ہے اور ہم اس کے تاجر ہیں (۳)۔

ہم کیسے انسان کی خلقت کے لئے کسی مقصد کے قائل نہیں ہو سکتے؟ حالانکہ جب ہم اپنے اطراف پر نظر ڈالتے ہیں اور مخلوقات کے ذریعہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ذرہ کا ایک مقصد ہے۔

۱، ۲، ۳: نجح البلاغہ: کلمات قصار اور حدیث مشہور ”الدنیا مزروعۃ الآخرۃ“ کا مضمون۔

ہمارے بدن کے عجیب و غریب کارخانے میں کوئی بھی چیز بے مقصد نہیں ہے یہاں تک کہ ہمارے آنکھوں کی پلکیں اور ہمارے تلوؤں کی گہرائی بھی بے مقصد نہیں ہے۔

یہ ممکن ہے کہ ہمارے وجود کا ہر جزو کوئی مقصد رکھتا ہو لیکن ہمارا پورا وجود بے مقصد ہو؟

جب ہم اپنے وجود سے باہر آ کر اس عظیم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہم اس کائنات میں موجود ہر چیز کو با مقصد پاتے سورج کی روشنی با مقصد ہے، بارش کا بر سنا با مقصد ہے اور ہوا کا چلن بھی با مقصد ہے، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ پوری کائنات بے مقصد ہو؟!

حقیقت یہ ہے کہ گویا اس عظیم کائنات کے بیچ میں مقصد کی نشاندہی کے لئے ایک بڑا سائز بورڈ نصب کیا گیا ہے ہم اس کی عظمت کے پیش نظر کبھی پہلے لمحات میں اسے دیکھ نہیں پاتے ہیں اس سائز بورڈ پر یہ عبارت لکھی گئی ہے: ”تربیت و تکامل“۔

اب جبکہ ہم اپنی خلقت کے مقصد کے بارے میں کسی حد تک آگاہ ہو گئے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری اس دنیا کی چند دنوں کی زندگی ان تمام مشکلوں، مصیبتوں اور ناکامیوں کے ساتھ ہماری خلقت کا مقصد ہو سکتی ہے؟

فرض کیجئے میں اس دنیا میں ساٹھ سال زندگی بسر کروں، ہر روز صبح سے شام تک روزی کمانے کے لئے کوشش کروں اور شام کو تھکا ہو اگھر لوٹوں، اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ میں اپنی پوری عمر میں کئی ٹن غذا اور پانی صرف کروں، بڑی زحمتوں اور محنتوں کے بعد ایک گھر تعمیر کروں، پھر اسے یہیں پر چھوڑ کر اس دنیا سے چلا جاؤں۔ کیا اس مقصد کی یہی اہمیت ہے کہ مجھے در دور نجح سے بھری اس چند روزہ زندگی کی طرف بلا یا جائے؟

اگر ایک انجینئر، ایک بیان کے بیچ میں ایک بڑی عمارت تعمیر کرے اور اس کو مکمل کرنے میں اسے برسوں لگ جائیں اور اس عمارت کو مکمل کرنے کے

بعد اس میں تمام ساز و سامان فراہم کرے۔ لیکن جب اسے اس عمارت کی تعمیر کے بارے میں سوال کریں کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟ تو وہ جواب میں کہے: میرا مقصد یہ ہے کہ جب تک یہ عمارت اس بیان میں موجود ہے جو بھی مسافر یہاں سے گزرے، اس میں ایک گھنٹہ آرام کرے! کیا یہ جواب سن کر ہم سب تعجب سے یہ نہیں کہیں گے: ایک مسافر کے ایک گھنٹہ آرام کے لئے اس قدر زحمتوں اور مختنوت کی ضرورت نہیں تھی!

بھی وجہ ہے کہ جو لوگ قیامت اور موت کے بعد والی زندگی کا عقیدہ نہیں رکھتے ہیں وہ اس دنیا کی زندگی کو فضول سمجھتے ہیں۔ مادہ پر ستون کی زبان سے یہ جملہ اکثر سنائی گیا ہے کہ اس دنیا کی زندگی بے مقصد ہے۔ حتیٰ بعض اوقات ان میں سے کچھ افراد خود کشی کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اس دنیا کی مادی اور مکر اور بے مقصد زندگی سے تنگ آ جاتے ہیں۔

جو چیز زندگی کو مقصد سمجھتی ہے اور اسے معقول اور با حکمت بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس زندگی کو دوسرا دنیا کے لئے مقدمہ سمجھا جائے اور اس زندگی کے مشکلات کو برداشت کرنا اور اس کے لئے اتنے دکھ در دلخانہ ایک ابدی زندگی کی راہ میں استفادہ کرنے کے لئے ہو۔

یہاں پر اس دلچسپ مثال کا پھر سے ذکر کرنا مناسب ہو گا جسے ہم نے اس سے پہلے بیان کیا ہے، یعنی اگرماں کے شکم میں موجود جنین صاحب عقل و شعور ہوتا اور اس سے کہا جاتا: ”تیری اس زندگی کے بعد کوئی خبر نہیں ہے،“ تو وہ اپنی زندگی پر اعتراض کرتے ہوئے کہتا: ”پس اس کا کیا مطلب ہے کہ میں اس جگہ قیدی بنا رہوں؟ خون پیتا رہوں اور ہاتھ پاؤں باندھے ہوئے ایک کونے میں پڑا رہوں اور اس کے بعد کچھ نہ ہو؟ پروردگار کا میری اس خلقت سے کیا مقصد تھا؟!“ لیکن اگر اسے اطمینان دلا جائے کہ یہ چند مہینے جلدی گزرنے والے ہیں اور یہ دنیا میں نسبتاً ایک طولانی زندگی کی آمدگی کا دور ہے، وہ دنیا اس جنین کے ماحول سے بہت زیادہ و سچ، پر نور اور بالشکوہ ہے اور اس کی نسبت زیادہ نعمتوں سے مالا مال ہے۔ ”اس وقت وہ مطمئن ہو جائے گا کہ اس کا جنینی دوران ایک بامعنی و بمقصد دور ہے اسی لئے قابل برداشت ہے۔

قرآن مجید سورہ واقعہ آیت نمبر ۶۲ میں ارشاد فرماتا ہے:

(ولقد علمتم النشأة الأولى فلوازن ذكرهن )

”اور تم پہلی خلقت کو توجہ نہ ہو تو پھر اس میں غور کیوں نہیں کرتے ہو؟ (کہ اس کے بعد بھی ایک جہان ہے)۔“

محض یہ کہ یہ دنیا اپنے تمام وجود سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اس کے بعد ایک اور دنیا ہے ورنہ یہ دنیا فضول، بیہودہ اور بے معنی ہوتی۔

اس بات کو قرآن مجید کی زبانی سنتے کہ سورہ مومنون کی آیت نمبر ۱۱۵ میں ارشاد فرماتا ہے:

(أَنْجِسْتُمْ أَنْمَا خَلْقَنَّمْ عَبْشَا وَأَنْكَمْ إِلَيْنَا لَاتِرْ جَعْنَ (

”کیا تم حمار اخیال یہ تھا کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف پلٹا کر نہیں لائے جاؤ گے؟“

اس کا اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ اگر ”معاد“ (جس کی تعبیر قرآن مجید میں خدا کی طرف پلٹنا ہے) کا وجود نہ ہوتا تو انسان کی خلقت عبث اور بیہودگی کے برابر ہوتی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خلقت کا فلسفہ کہتا ہے: اس عالم کے بعد ایک اور عالم کا وجود ضروری ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ خدا کی صفات کا مخلوق کی صفات سے کیوں موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے؟

۲۔ ہماری خلقت کا مقصد کیا ہے؟

۳۔ کیا اس دنیا کی زندگی انسان کی خلقت کا مقصد ہو سکتی ہے۔

۴۔ جنین کی زندگی کا اس دنیا کی زندگی سے موازنہ ہمیں کیا سکھاتا ہے؟

۵۔ قرآن مجید اس دنیا کی تحقیق سے آخرت کے وجود پر کیسے استدلال کرتا ہے؟

## آٹھواں سبق

روح کی بقاء، قیامت کی ایک علامت

کوئی شخص نہیں جانتا ہے کہ انسان کب سے ”روح“ کے وجود کے بارے میں فکر کرنے لگا ہے۔

صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ انسان ابتداء سے ہی اپنے اور اس دنیا کی دوسری مخلوقات کے درمیان فرق کا مشاہدہ کرتا رہا ہے، اپنے اور پتھر، لکڑی، پہاڑ اور صحرائے درمیان فرق، اپنے اور حیوانات کے درمیان فرق۔

انسان نے خواب کی حالت کو دیکھا تھا، اسی طرح اس نے موت کی حالت کو بھی دیکھا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ خواب اور موت کے دوران بغیر اس کے کہ جسم و مادہ میں کوئی تبدیلی ایجاد ہوا سکی حالت میں ایک عظیم تغیر و تحول پیدا ہوتا ہے، یہیں سے اس نے سمجھا کہ اس جسم کے علاوہ ایک اور گوہر بھی اس کے اختیار میں ہے۔

اس کے علاوہ وہ دیکھ رہا تھا کہ حیوانات سے بھی فرق رکھتا ہے، کیونکہ وہ فیصلے لینے میں اختیار و آزادی کا مالک ہے، جبکہ حیوانات کی نقل و حرکت نظری اور جری ہے۔

بانخصوص نیند کی حالت میں جب اس کے بدن کے تمام اعضاء ایک کونے میں خاموش پڑے ہوتے تھے اور وہ خواب میں مختلف مناظر کا مشاہدہ کرتا تھا تو اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ ایک مخفی اور پُرسار طاقت اس کے وجود پر حکم فرمائے، تو اس نے اس کا نام ”روح“ رکھا۔

جب عالم بشریت کے مفکرین نے فلاسفہ کی نیادِ الٰٰ تو ”روح“ ایک اہم فلسفی مسئلہ کے عنوان سے دوسرے مسائل کی فہرست میں قرار پائی۔ اس کے بعد تمام فلاسفہ نے اس کے بارے میں اپنے نظریات پیش کئے، یہاں تک کہ بعض اسلامی علماء کے کہنے کے مطابق، روح کی حقیقت اور اس سے مر بوط دوسرے مسائل کے بارے میں تقریباً ”ایک ہزار اقوال و نظریات“ پیش کئے گئے ہیں۔ یہ ایک لمبی بحث ہے، لیکن جس اہم مطلب کو جانتا ضروری ہے، وہ اس سوال کا جواب ہے:

کیا روح مادہ ہے یا غیر مادہ؟ دوسرے الفاظ میں: کیا روح مستقل ہے یا مغز واعصاب کے سلسلہ کے مادی اور کیمیاولی خصوصیات میں سے ہے؟ بعض مادی فلاسفہ اس بات پر مصر ہیں کہ روح اور اس سے متعلق مظاہر بھی مادی ہیں اور مغز کے خلیوں کے خواص میں سے ہیں، اور جب انسان مرتا ہے تو اس کے ساتھ روح بھی نابود ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح کہ ایک گھری پر ہٹھوڑی مار کر اسے توڑ دیا جائے تو اس گھری کا چنانچہ بند ہو جاتا ہے! اس گروہ کے مقابلہ میں الٰہی فلاسفہ ہیں، حتیٰ بعض مادی فلاسفہ بھی جو روح کی حقیقت کے قائل ہیں، وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ بدن کے مرنے سے روح نہیں مرتی بلکہ وہ باقی رہتی ہے۔

اس مسئلہ، یعنی روح کی حقیقت، استقلال اور بقاء کو ثابت کرنے کے لئے کافی اور پیچیدہ دلائل پیش کی گئی ہیں کہ ہم یہاں پر ان میں سے بعض واضح ترین دلائل کو آسان اور روشن عبارتوں میں اپنے عزیز نوجوانوں کی آگاہی کے لئے بیان کرتے ہیں:

۱۔ ایک وسیع کائنات ایک چھوٹی جگہ میں نہیں سما سکتی  
فرض کیجئے آپ ایک عظیم سمندر کے کنارے بیٹھے ہیں۔ اس کے ساحل پر سربنک پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے۔ پانی کی گرجتی لہریں مسلسل ساحلی چٹانوں سے ٹکراتی ہیں اور غضب کی حالت میں سمندر کی طرف پلٹ جاتی ہیں۔  
پہاڑ کے دامن میں واقع بڑی بڑی چٹانیں بتاری ہیں کہ پہاڑوں پر کیا نوغایہ، نیگوں آسمان بھی اس پہاڑ اور سمندر پر خیمد لگائے ہوئے ہے اور رات کے وقت اپنی عظمت و شکوه کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

ہم ایک لمحہ اس منظر کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے اس منظر کو اپنے ذہن میں اسی شان و شوکت اور عظمت کے ساتھ مجسم کرتے ہیں۔  
بے شک اس ذہنی نقشہ اور اس عظیم منظر اور تصور کے لئے ایک مناسب جگہ کی ضرورت ہے، ممکن نہیں ہے کہ یہ نقشہ مغز کی چھوٹی خلیوں میں سما کے، اگر ایسا ہو تو ایک بڑا نقشہ ایک چھوٹے سے نقطہ پر سمائے گا (جو محال ہے)، جبکہ ہم اس نقشہ کو اس کی تمام عظمتوں کے ساتھ اپنے ذہن میں احساس کرتے ہیں۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم جسم اور مغز کی خلیوں کے علاوہ ایک اور گوہ رکھتے ہیں اور ہر اندازہ کے نقشہ کو اپنے اندر منعکس کر سکتا ہے، یقیناً یہ گوہ عالم مادہ سے ماوراء ہے، کیونکہ مادی دنیا میں ہمیں ایسی چیز نہیں ملتی ہے۔

۲۔ ہیروفنی دنیا میں روح کے انکاس کی خصوصیت

ہم اپنے وجود کے اندر بہت سی طبیعیاتی اور کیمیا وی خاصیت رکھتے ہیں، معدہ اور دل کی حرکتیں طبیعیاتی عمل ہیں، لیکن آب دہن اور معدہ کی رطوبت کا غذا پر اثر ایک کیمیا وی عمل ہے۔ اور اس قسم کے عوامل ہمارے پورے جسم میں فراواں صورت میں پائے جاتے ہیں۔

اگر روح، سوچ اور فکر سب مغز کی خلیوں کی مادی، طبیعیاتی اور کیمیا وی خاصیتیں ہیں، تو ان میں اور ہمارے جسم کی دوسری خصوصیتوں میں کیوں فرق پا یا جاتا ہے؟

فکر و اندیشہ اور روح بیرونی دنیا کے ساتھ ہمارے رابطہ اور پیوند کو برقرار کرتی ہیں اور ہمارے ارد گرد گزرنے والے حالات سے ہمیں آگاہ کرتی ہیں، لیکن لعاب دہن اور معدہ کی رطوبت کی کیمیائی خاصیت اور آنکھ، زبان، اور دل کی طبیعیاتی حرکتیں ہرگز یہ حالت نہیں رکھتی ہیں۔

دوسرے الفاظ میں، ہم بخوبی احساس کرتے ہیں کہ ہمارا وجود بیرونی دنیا سے مر بوط ہے، اور ہم اس کے مسائل سے آگاہ ہیں، کیا بیرونی دنیا ہمارے اندر داخل ہوتی ہے؟ یقیناً نہیں، پس مسئلہ کیا ہے؟

یقیناً بیرونی دنیا کا نقشہ ہمارے پاس آتا ہے اور ہم روح کی بیرونی منظر کشی کی خاصیت سے استفادہ کے ذریعہ اپنے وجود سے باہر والی دنیا کے بارے میں آگاہ ہوتے ہیں اور یہ خاصیت ہمارے جسم کے کسی بھی طبیعیاتی اور کیمیائی حصہ میں موجود نہیں ہے۔ (غور کریں)

دوسری عبارت میں: بیرونی اور عینی مخلوقات سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ان پر ایک قسم کا تسلط اور حاوی ہونا ضروری ہے۔ یہ کام مغز کی خلیوں کا نہیں ہے، مغز کی خلیے صرف باہر سے متاثر ہو سکتی ہیں، جس طرح جسم کی دوسری خلیے متاثر ہوتی ہیں۔

اس فرق سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں پر طبیعیاتی اور کیمیائی تبدیلیوں کے علاوہ ایک اور حقیقت کا وجود ہے جو ہمیں اپنے وجود سے باہر والی دنیا پر مسلط اور حاوی کرتی ہے اور یہ ”روح“ کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، جو مادی دنیا اور مادہ کی خصوصیات سے بالاتر ہے۔

### ۳۔ روح کے حقیقی اور مستقل ہونے پر تجرباتی دلائل

خوش قسمتی سے آج دنیا کے دانشوروں اور سائنسدانوں نے مختلف علمی اور تجربی طریقوں سے روح کی حقیقت اور اس کے مستقل ہونے کو ثابت کیا ہے اور ان لوگوں کا دلائلان شکن جواب دیا ہے جو روح کے مستقل ہونے کے منکر ہیں اور اسے مادہ کی خصوصیات سے نیزاں کا تابع جانتے ہیں۔

ا۔ مقناطیسی خواب (ہیپنوتزم یا میگنیٹزم) ان محکام دلائل میں سے ہیں جو بہت سے تجربوں کے بعد ثابت ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، جن لوگوں نے ان کو نہیں دیکھا ہے، ان کے لئے تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہے:

کچھ افراد مختلف علمی طریقوں سے کسی اور شخص کے ذریعہ نیند میں چلے جاتے ہیں، کسی کو نیند میں ڈالنے والے کو ”عامل“ کہا جاتا ہے اور نیند میں چلا جانے والا ”میڈیم“ کہلاتا ہے۔ ”میڈیم“، شخص تلقین، فکری تمرکز، اور آنکھ کی مقناطیسی قوت جیسی چیزوں کے ذریعہ ایک گھری نیند میں چلا جاتا ہے، لیکن یہ نیند عام نیند کے مانند نہیں ہوتی ہے، بلکہ یہ ایک ایسی نیند ہوتی ہے جس میں سونے والے (میڈیم) سے رابطہ برقرار کیا جا سکتا ہے، اس سے بات کی جا سکتی ہے اور اس کا جواب سن جا سکتا ہے۔

اسی حالت میں روح سونے والے کو مختلف جگہوں پر بھیجتی ہے، کبھی وہاں سے اپنے ساتھ تازہ خبریں لے آتا ہے اور ایسے مسائل کی اطلاع حاصل کرتا ہے، جن کے بارے میں عام حالت میں اسے کوئی خبر نہیں ہوتی ہے۔

کبھی اس حالت میں ریاضی کے پیچیدہ ترین سوال حل کرتا ہے۔

کبھی اس مقناتیسی نیند کے دوران اپنی مادری زبان کے علاوہ ایک ایسی زبان میں بات کرتا ہے، جس سے وہ کبھی آشنا نہیں تھا۔  
کبھی کسی مقلع صندوق میں رکھے ہوئے کاغذ پر کچھ مطالب وہ لکھ دیتا ہے۔

حتیٰ کہ کبھی ارواح، شج (دور سے نظر آنے والے جسم) کی صورت میں اور کبھی واضح سایلوں کی صورت میں اس قسم کے اجتماعات میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کی تفصیل ہم نے کتاب ”عودارواح“ میں بیان کی ہے۔

۲۔ ”اپر ٹزم“ یا ”موت کے بعد ارواح سے ارتباط“ روح کی حقیقت اور استقلال کی ایک دلیل ہے۔

اس وقت بھی ”روحیون کی جماعتوں“ کے نام سے دنیا بھر میں کچھ ایسے افراد موجود ہیں۔ جن کے بارے میں مصری دانشور ”فرید وجدي“ کا کہنا ہے کہ ان کی طرف سے تقریباً تین سور سالے اور روز نامے دنیا بھر میں شائع ہوتے ہیں۔ مختلف شخصیتوں پر مشتمل معروف افراد ان کے جلوسوں میں شرکت کرتے ہیں اور ان کے سامنے ارواح سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ بہت سے غیر معمولی کام بھی انجام دئے جاتے ہیں۔

اگرچہ بعض فریب کار، روح سے ارتباط کے مسئلہ کے بارے میں کسی قسم کا علم رکھے بغیر لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے ارواح سے رابطہ کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس طرح اس سے کافی حد تک ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن یہ فریب کاری اس حقیقت کے سلسلہ میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتی ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا بڑے بڑے محققین نے اعتراض کیا ہے اور وہ ارواح کے ساتھ رابطہ کا مکن ہونا ہے (۱)۔

یہ سب انسان کی روح کی حقیقت، اس کے استقلال اور مرنے کے بعد باقی رہنے کی دلیل ہے، اور معاد اور موت کے بعد زندگی کی حقیقت کے سلسلہ میں ایک مؤثر قدم ہے۔

۳۔ وہ خواب جو ہم دیکھتے ہیں اور خواب کی حالت میں ہمارے سامنے مجسم ہونے والے مناظر کبھی مستقبل میں رونما ہونے والے حوادث سے پردا اٹھاتے ہیں اور پوشیدہ مسائل کو آشکار کرتے ہیں، ان کو ہم محض اتفاق نہیں کہہ سکتے، بلکہ یہ بھی روح کی حقیقت و استقلال کی ایک اور دلیل ہیں۔

اکثر افراد نے اپنی زندگی میں سچے خواب دیکھے ہیں اس کے علاوہ سنتے آئے ہیں کہ فلاں دوست نے ایک ایسا خواب دیکھا ہے کہ ایک مدت کے بعد کسی کی بیش کے بغیر اس کی تعبیر سچ نکلی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی روح کا خواب کی

۔ اس کی مزید وضاحت کے لئے کتاب ”عودارواح“ اور کتاب ”معاد و جہان پس از مرگ“ کی طرف رجوع فرمائیں۔  
حالت میں دوسرے عوالم سے رابط ہوتا ہے اور وہ کبھی مستقبل میں رونما ہونے والے حوادث کا مشاہدہ کرتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ امور بخوبی ثابت کرتے ہیں کہ روح دادی نہیں ہے اور یہ انسان کے مغز کی طبیعتی اور کیمیائی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ یہ ماوراء طبیعت ایک حقیقت ہے جو اس جسم کے مرنے سے نابود نہیں ہوتی ہے اور یہ امور بذات خود مسئلہ معاد اور موت کے بعد عالم آخرت کو ثابت کرنے کے لئے راہ کو ہمارا کرتی ہیں۔

## غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ روح کے مسئلہ میں اُنی فلسفہ اور مادی افراد کے درمیان کیا فرق ہے؟

۲۔ روح کی حقیقت کی ایک دلیل ”بڑی چیز کا چھوٹی جگہ میں نہ سماں ہے“ اس سے مراد کیا ہے؟

۳۔ ”مقناطیسی خواب“ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۴۔ ارواح کے ساتھ ارتباٹ سے کیا مراد ہے؟

۵۔ سچے خواب کس طرح روح کی حقیقت اور استقلال کی دلیل ہے؟

## نواں سبق

جسمانی اور روحانی معاد

معاد کی بحث میں پیش آنے والے اہم سوالات یہ ہیں کہ کیا ”معاد“ صرف روحانی پہلو رکھتی ہے یا انسان کا جسم و بدن بھی دوسری دنیا میں لوٹ آئے گا؟ اور انسان اسی دنیوی روح و جسم کے ساتھ صرف بلند تر درجہ کے ساتھ دوسری دنیا میں زندگی کو جاری رکھے گا؟

پرانے زمانہ کے بعض فلاسفہ صرف روحانی معاد کے قائل تھے اور جسم کو ایسا مر کب جانتے تھے جو صرف اس دنیا سے مربوط ہے اور موت کے بعد انسان اس کا محتاج نہیں ہو گا، اسے چھوڑ کر عالمِ ارواح میں پرواز کرے گا۔

لیکن اسلام کے عظیم علماء اور بہت سے فلاسفہ کا عقیدہ یہ ہے کہ معاد دونوں صورتوں میں یعنی ”روحانی“ و ”جسمانی“ ہو گی۔ صحیح ہے کہ یہ جسم خاک بن جائے گا اور یہ خاک زمین میں پر اگندا ہو کر گم ہو جائے گی، لیکن پروردگار قادر و عالم ان تمام ذرات کو قیامت کے دن دوبارہ اکٹھا کر کے انھیں زندگی سخنے گا اور اس موضوع کو ”جسمانی معاد“ کہا جاتا ہے، کیونکہ روح کے پھر سے لوٹنے کو قطعی سمجھا گیا ہے اور چونکہ بحث صرف جسم کے لوٹنے کی ہے، یہ نام اسی عقیدہ کے لئے رکھا گیا ہے۔

بہر حال معاد سے متعلق، قرآن مجید میں مختلف اور کافی تعداد میں موجود آیات بھی ”جسمانی معاد“ پر دلالت کرتی ہیں۔

جسمانی معاد پر قرآنی شواہد

ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح ایک صحرائی عرب نے ایک بوسیدہ ہڈی کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر کے سوال کیا تھا کہ کون اسے پھر سے زندہ کر سکتا ہے؟ اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے جواب دیا تھا کہ وہی خدا اسے پھر سے زندہ کر سکتا ہے جس نے اسے پہلے خلق کیا ہے، وہی جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور سبزے درخت سے آگ نکالی ہے۔ اس واقعہ سے مربوط آیات سورہ یس کی آخر میں آئی ہیں۔

قرآن مجید کا دوسری جگہ پر ارشاد ہے:

”تم لوگ قیامت کے دن قبروں سے باہر آؤ گے۔“

(سورہ یس، آیہ ۱۵، قمر، ۷)

ہم جانتے ہیں کہ قبریں خاک شدہ جسموں کی جگہ ہیں نہ روح کی۔

نبیادی طور پر معاد کے مکاروں کا تعجب اس بات پر تھا کہ وہ کہتے تھے: ”جب ہم خاک میں تبدیل ہو جائیں گے اور یہ خاک پر اگندا ہو جائے گی تو ہم کیسے پھر سے زندہ ہو جائیں گے؟“

(وَقَالُوا عِزْزاً أَضْلَلْنَا فِي الْأَرْضِ عِزْزاً فَلَمْ يَنْفَعُ خَلْقَ جَدِيدٍ) (سورہ سجدہ، ۱۰)

اور یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم زمین میں گم ہو گئے تو کیا نئی خلقت میں پھر ظاہر کئے جائیں گے؟“

قرآن مجید جواب میں ارشاد فرماتا ہے:

(اولم یروکیف یب دی اللہ لخلق ثم یعیدہ لان ذکر علی السالیسیر) (سورہ عکبوت ۱۹)

”کیا ان لوگوں نے نبیں دیکھا کہ خدا کس طرح خلوقات کو ایجاد کرتا ہے اور پھر دوبارہ واپس لے جاتا ہے، یہ سب اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔“

ایک عرب جاہل کہتا تھا:

(أَيَعْدُكُمْ أَنْكِمْ إِذَا مُتُّمْ وَكُنْتُمْ تَرَابًا وَعَظَمًا أَنْكِمْ تُخْرِجُونَ) (سورہ مومنون ۳۵)

”کیا یہ تم سے اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور ہڈی ہو جاؤ گے تو پھر دوبارہ نکالے جاؤ گے؟“

قرآن مجید کی مذکورہ تمام تعبیرات اور اس موضوع سے متعلق دوسری آیات واضح طور پر دلالت کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر جگہ پر ”جسمانی معاد“ کی بات کرتے تھے اور تنگ نظر مشرکین کا تجھ بھی اسی بات پر تھا۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ قرآن مجید اسی جسمانی معاد کے چند نمونوں کو نباتات وغیرہ کے سلسلہ میں پیش کر کے ان کے لئے تشریع فرماتا ہے اور ابتدائی خلقت اور خدا کی قدرت کو شاہد کے طور پر پیش کرتا ہے۔

اس لئے ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص مسلمان ہو اور قرآن مجید سے تھوڑی سی واقفیت رکھتے ہوئے جسمانی معاد کا منکر ہو۔ قرآن مجید کی نظر میں جسمانی معاد کا انکار اصل معاد کے انکار کے برابر ہے۔

#### عقلی شواہد

اس کے علاوہ عقل بھی کہتی ہے کہ روح اور بدن الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں، یہ دونوں مستقل ہونے کے باوجود آپس میں پیوند اور رابطہ رکھتے ہیں، دونوں ایک ساتھ نشوونما پاتے ہیں، اور یقیناً ابدی اور جاودائی زندگی کے لئے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

اگرچہ دونوں (روح اور بدن) بزرگی مدت (دنیا آخرت کے درمیان فاصلہ) کے دوران کچھ مدت تک ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں، لیکن ہمیشہ کے لئے یہ دوری ممکن نہیں ہے۔ جس طرح روح کے بغیر جسم ناقص ہے اسی طرح روح بھی جسم کے بغیر ناقص ہے۔ روح حکم فرم اور عامل حرکت ہے اور بدن فرمانبردار اور سیلہ عمل ہے، کوئی بھی حکم فرم، فرمانبردار سے اور کوئی بھی ہنر مندو سیلہ عمل سے بے نیاز نہیں ہوتا ہے۔

چونکہ آخرت میں روح اس دنیا کی نسبت ایک بلند تر سطح پر قرار پائے گی اس لئے اسی نسبت سے جسم کو بھی کمال حاصل کرنا چاہئے، اور ضرور ایسا ہی ہو گا، یعنی انسان کا جسم قیامت کے دن اس دنیا کی فرسودگی، عیوب اور نقص سے خالی ہو گا۔

بہر حال جسم و روح ایک دوسرے کی ہمزا اور مکمل کرنے والے ہیں اور معاد صرف روحانی یا صرف جسمانی نہیں ہو سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں جسم و روح کی خلقت اور ان کے آپسی رابطہ اور پیوند کی حالت کا مطالعہ اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ معاد جسمانی و روحانی دونوں صورتوں میں واقع ہو گی

دوسری طرف انصاف و عدالت کا قانون بھی یہی کہتا ہے: معاد دونوں پہلوؤں سے (جسمانی و روحانی) ہونی چاہئے۔ کیونکہ اگر انسان کسی گناہ کا مر تکب ہوا ہے۔ تو اس نے اس گناہ کو اس روح اور جسم کے ذریعہ انجام دیا ہے، اور اگر اس نے کوئی نیک کام انجام دیا ہے تو وہ بھی اس جسم و روح سے انجام دیا ہے اس لئے اس کی جزا اور سزا بھی اسی روح اور بدن کو ملنی چاہئے۔ اگر صرف جسم ہی پلٹے گا یا صرف روح ہی پلٹے گی اور ان میں سے صرف ایک ہی کو جزا مزرا

ملے گی، تو عدل و انصاف کا قانون نافذ نہیں ہو گا۔

جسمانی معادے متعلق چند سوالات

دانشوروں نے اس سلسلہ میں متعدد سوالات پیش کئے ہیں کہ بحث کو مکمل کرنے کے لئے ان میں سے بعض کا ذکر جواب کے ساتھ ضروری ہے:  
۱۔ علوم طبیعتیات (natural sciences) کے دانشوروں کی تحقیقات کے مطابق، انسان کا بدن اس کی پوری عمر کے دوران کئی بار تبدیل ہوتا ہے۔ اس کی مثال اس پانی کے حوض جیسی ہے، جس میں ایک طرف سے پانی داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے رفتہ رفتہ باہر نکلتا ہے ظاہر ہے کہ ایک مدت کے بعد اس حوض کا پورا پانی تبدیل ہو جاتا ہے۔

انسان کے بدن میں یہ صورت احتلاہ سات سال کے بعد ایک بار پیش آتی ہے، اس لئے انسان کا بدن اس کی پوری حیات کے دوران کئی بار تبدیل ہوتا ہے!

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے جسموں میں سے کون سا جسم قیامت کے دن لوٹے گا؟

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں: ان میں سے انسان کا آخری بدن لوٹے گا، جیسا کہ مذکورہ آیات میں ہم نے پڑھا کہ خداوند متعال انسانوں کو انہی پوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیوں سے دوبارہ زندہ کرے گا۔ اور اس بات کے یہ معنی ہیں کہ انسان کا آخری بدن لوٹے گا، اسی طرح قبروں سے مردوں کے اٹھ کر لئے سے بھی آخری بدن کے زندہ ہونے کے معنی نکتے ہیں۔

لیکن اہم نکتہ یہ ہے کہ انسان کا آخری بدن اپنے اندر وہ تمام آثار اور خصوصیات محفوظ رکھتا ہے جو اس کی پوری عمر میں مختلف بدن رکھتے تھے۔

دوسرے الفاظ میں: جو بدن تدریجیاً بود ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آثار و خصوصیات کو آنے والے دوسرے بدن میں منتقل کرتے ہیں، اس لئے آخری بدن گز شنیہ تمام بدنوں کا وارث ہوتا ہے اور عدل و انصاف کے قانون کے تحت تمام جزا و سزا کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔

۲۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم خاک میں تبدیل ہو جائیں گے اور ہمارے بدن کے ذرات پر دوں اور میووں میں تبدیل ہو جائیں گے، اور نتیجہ کے طور پر دوسرے انسان کے بدن کے جزو بن جائیں گے تو قیامت کے دن کیا ہو گا؟ (یہ وہی چیز ہے جسے فلسفہ و کلام کے علم میں ”شبہ“ آکل دماںول“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے)

اگرچہ اس سوال کا جواب تفصیلی بحث کا حامل ہے، لیکن ہم ایک مختصر عبارت میں ضرورت بھراں پر بحث کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے: جس انسان کے بدن کے ذرات خاک میں تبدیل ہونے کے بعد دوسرے بدن میں منتقل ہوتے ہیں، وہ یقیناً پہلے بدن میں واپس آ جاتے ہیں۔ (مذکورہ آیات بھی اس دعویٰ کی واضح شاہد ہیں)

یہاں پر بظاہر جو مشکل نظر آتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ دوسرے بدن ناقص ہو جائے گا۔

لیکن حقیقت میں یہ دوسرے بدن ناقص نہیں ہوتا ہے بلکہ چھوٹا ہوتا ہے، چونکہ یہ ذرات تمام بدن میں پھیلے ہوئے تھے، جب اس سے واپس لئے جاتے ہیں تو وہ بدن اسی نسبت سے ضعیف اور چھوٹا ہو جاتا ہے۔

اس لئے نہ پہلا بدن نابود ہوتا ہے اور نہ دوسرا بدن، صرف جو چیز یہاں پر وجود میں آتی ہے وہ دوسرے بدن کا چھوٹا ہونا ہے اور یہ امر کبھی کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قیامت کے دن تمام بدن کمال حاصل کریں گے، اور ناقص اور کمیاں دور ہو جائیں گی، جس طرح ایک بچہ نشوونما

پاتا ہے۔ یا ایک زخم کے زخم میں نئے سرے سے گوشت بھر جاتا ہے اور اس کی شخصیت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح قیامت کے دن چھوٹے اور ناقص بدن مکمل صورت میں زندہ ہوں گے، کیونکہ قیامت عالم کمال ہے۔ اس طرح اس سلسلہ میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی ہے (غور کیجئے۔ مزید وضاحت کے لئے کتاب ”معاد و جہان پس از مرگ“ کی طرف رجوع کیجئے)۔

### غور کیجئے اور جواب دیجئے

- ۱۔ کیا قیامت کے دن انسان کی زندگی ہر لحاظ سے اس دنیا جیسی زندگی ہے؟
- ۲۔ کیا ہم قیامت کے دن جزا و سزا کو اس دنیا میں بالکل درک کر سکتے ہیں؟
- ۳۔ کیا ہشمت کی نعمتیں اور جہنم کے عذاب صرف جسم سے مربوط ہیں۔
- ۴۔ اعمال کے مجسم ہونے سے مراد کیا ہے اور قرآن مجید نے اس سلسلہ میں کیسے دلالت کی ہیں؟
- ۵۔ اعمال کے مجسم ہونے کا عقیدہ معاد کی بحث کی کن مشکلات کا جواب دیتا ہے۔

## دسوال سبق

جنت، جہنم اور تجہیم اعمال

بہت سے لوگ اپنے آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا موت کے بعد عالم آخرت بالکل اسی دنیا کے مانند ہے یا اس سے فرق رکھتا ہے؟ کیا اس عالم کی

نعمتیں، سزاویں، اور مختصر یہ کہ اس پر حکم فرمانظام اور قوانین اسی دنیا جیسے ہیں؟

اس کے جواب میں واضح طور پر کہنا چاہئے کہ ہمارے پاس بہت سے ایسے شواہد موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا اور اس دنیا میں کافی فرق ہے، حتیٰ کہ اس حد تک فرق ہے کہ جو کچھ ہم اس دنیا کے بارے میں جانتے ہیں وہ ایک ایسی سیاہی جسم کے مانندے ہے ہم دور سے دیکھتے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم اس سلسلہ میں اسی "جنین" والی مثال سے استفادہ کریں: جس قدر "جنین" کی دنیا اور اس دنیا میں فرق ہے، اسی قدر یا اس سے زیادہ اس دنیا اور دوسری دنیا کے درمیان فرق ہے۔

اگر ماں کے شکم (عالم جنین) میں موجود بچہ عقل و شعور رکھتا اور باہر کی دنیا، آسمان، زمین، چاند، سورج، ستاروں، پہاڑوں، جنگلوں اور سمندروں کے بارے میں ایک صحیح تصویر کشی کرنا چاہتا تو وہ ہر گز یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔

عالم جنین میں موجود بچہ جس نے اپنی ماں کے انتہائی مدد و شکم کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا ہے، اس کے لئے اس دنیا کے چاند، سورج، سمندر، امواں، طوفان، باد نیم، اور پھولوں کی خوبصورتی کا کوئی مفہوم و معنی نہیں ہے، اس کی لغت کی کتاب صرف چند الفاظ پر مشتمل ہے۔ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ ماں کے شکم کے باہر سے کوئی اس سے بات کرے تو وہ ہر گز اس کی بات کے معنی تک نہیں سمجھ سکتا ہے۔

اس مدد و دنیا اور اس دوسری و سیعی دنیا کے درمیان فرق ایسا ہی یا اس سے زیادہ ہے، لہذا ہم کبھی دوسری دنیا کی نعمتوں اور بہشت برین کی حقیقت کے بارے میں ہر گز آگاہ نہیں ہو سکتے ہیں۔

اسی وجہ سے ایک حدیث یہ ہے:

"فَيَحَا مَا لَا يُعِينُ رَأْتُ وَلَا ذَذَنْ سَمْعُتْ وَلَا خَطْرٌ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ"

"بہشت میں ایسی نعمتیں ہیں کہ جنہیں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا ہے، کسی کان نے نہیں سنتا ہے اور نہ کسی کے دل میں ان کا تصور پیدا ہوا ہے۔"

قرآن مجید اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے:

"فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا تَنْفَعُ لَمْ مِنْ قِرْأَعِينٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ" (سورہ سجدہ ۷۱)

"پس کسی نفس کو نہیں معلوم ہے کہ اس کے لئے (وہاں پر) کیا کیا نتیجی چشم کا سامان چھپا کر رکھا گیا ہے جو ان کے اعمال کی جزا ہے۔"

اس دنیا پر حکم فرمانظام بھی اس دنیا کے نظام سے کافی فرق رکھتا ہے، مثلاً: قیامت کی عدالت میں انسان کے ہاتھ، پاؤں، اس کے جسم کی جلد اور یہاں تک

کہ جس زمین پر گناہ یا ثواب انجام دیا ہے اس کے اعمال کے گواہ ہوں گے:

قرآن مجید میں سورہ یس کی آیت نمبر ۲۵ میں ارشاد ہوا ہے:

(الْيَوْمَ نَخْتَمُ عَلَى أَفْوَاهِهِمْ وَلَكُلِّ مِنْ أَيْدِيهِمْ وَتَشَهَّدُ جَلَمْبُونٌ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ)

"آج ہم ان کے منہ پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ کیسے اعمال انجام دیا کرتے تھے۔"

دوسری جگہ پر سورہ فصلت کی آیت نمبر ۲۱ میں فرماتا ہے:

(وَقَالَ الْجَبَوْدُ حَمْنَانُ اللَّهُمَّ انْطِقْ كُلَّ شَيْءٍ (...)

"اور وہ اپنے اعضا سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیسے شہادت دیدی؟ تو وہ جواب دیں گے کہ ہمیں اسی خدا نے گویا بنا یا ہے جس نے سب کو گویا کی

عطائیکی ہے (تاکہ ہم حقائق بیان کریں)“

البته ایک زمانہ میں اس قسم کے مسائل کا تصور کرنا مشکل تھا، لیکن علم کی ترقی کے پیش نظر مناظر اور آواز کو رکارڈ اور ضبط کرنے کے نمونوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ چیز باعث حیرت نہیں ہے۔

بہر حال اگرچہ عالم آخرت کی نعمتوں کے بارے میں ہمارا تصور صرف دور سے نظر آنے والی ایک جسم کی سیاہی کے متراوف ہے اور ان کی وسعت اور اہمیت سے صحیح معنوں میں آگاہ نہیں ہو سکتے ہیں، لیکن اس حد تک جانتے ہیں کہ اس عالم کی نعمتوں اور سزا میں، جسمانی اور روحانی دونوں صورتوں میں ہیں، کیونکہ معاد دونوں پہلوں کھلتی ہے لہذا فطری طور پر اس کی جزا و سزا بھی دونوں جنبوں کے ساتھ ہوئی چاہئے۔ یعنی جس طرح مادی و جسمانی جنبوں کے بارے میں سورہ لقہ کی آیت نمبر ۲۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَبِشَّرَ اللَّهُمَّ إِنَّمَا نَوَّا عَمَلَ الصلحتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّةٌ مَّنْ تَجَرَّى مِنْ تَحْتَهَا إِلَّا نَخْرُجُ... وَلَهُمْ فِيهَا زَوْجٌ مُطْهَرٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ)

”پیغمبر: آپ ایمان اور عمل صالح والوں کو بشارت دیں کہ ان کے لئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہیں جاری ہیں... اور ان کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں بھی ہوں گی اور انھیں اس میں ہمیشہ رہنا بھی ہے۔“

اسی طرح قرآن مجید، معنوی نعمتوں کے بارے میں بھی سورہ توبہ کی آیت نمبر ۲۷ میں ارشاد فرماتا ہے:

(وَرَضُوا نَّمِنَ السَّلَامَكَبِرَ)

”بہشتیوں کو ملنے والی اللہ کی خوشنودی اور رضایت ان تمام نعمتوں سے برتر ہے۔“

جی ہاں، بہشتی اس احساس سے کہ خداوند متعال ان سے راضی ہے اور پروردگار عالم نے انھیں قبول کیا ہے، اس قدر خوشنودی اور لذت کا احساس کرتے ہیں کہ اس کا کسی چیز سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جہنمیوں کے بارے میں بھی جسمانی عذاب اور آگ کے علاوہ ان پر خداوند متعال کا خشم و غضب اور اس سے ناراضی ہر جسمانی عذاب سے بدتر ہے۔

اعمال کا مجسم ہونا

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن ہمارے اعمال زندہ ہوں گے اور مختلف شکلوں میں ہمارے ساتھ ہوں گے، جزا و سزا کی اہم بالوں میں سے ایک بھی اعمال کا مجسم ہونا ہے۔

ظلم و ستم، کالے بادلوں کی صورت میں ہمارا محاصرہ کریں گے جیسا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک حدیث میں آیا ہے :

(الظُّلْمُ هُوَ الظُّلْمَاتُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)

”ظلم قیامت کے دن تاریکیاں ہے۔“

ناجائز طریقے سے کھایا ہوا تینیوں کا مال آگ کے شعلوں کے مانند ہمیں گھیر لے گا۔ اس سلسلہ میں سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۰۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

(إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ إِلَيْهِمْ ظُلْمٌ إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيُصْلَوْنَ سَيِّرًا)

”جو لوگ ظالمانہ انداز سے تینیوں کا مال کھا جاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ یہیں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب واصل جنم ہوں گے۔“

ایمان، نور و شنی کی صورت میں ہمارے اطراف کو منور کرے گا۔ اس سلسلہ میں سورہ حدیہ کی آیت نمبر ۱۲ میں ارشاد الی ہے:

(يَوْمَ تُرِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ يَسْعَى نُورٌ لَهُنَّ بَينَ أَيْدِيهِنَّ بِحِمْمٍ (...)

”اس دن تم با یمان مردوں اور با یمان عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ایمان ان کے آگے آگے اور دائی طرف چل رہا ہے“...

سودخور، جنہوں نے اپنے برے اور بے شرما نہ عمل سے معاشرہ کے اقتصادی توازن کو درہم کیا ہو گا، وہ مرگی کے مریضوں کی طرح ہوں گے جو اٹھتے وقت اپنا توازن برقرار رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، کبھی زمین پر گرتے ہیں اور کبھی لڑکھڑاتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ (سورہ بقرہ ۲۷)

جو مال ذخیرہ اندوزوں اور مالدار کنجوسوں نے جمع کر کے اس سے محروم ہوں گا، وہ ان کے لئے ایک بھاری طوق کے مانند ان کی گردان میں اس طرح لٹکا دیا جائے گا کہ وہ حرکت کرنے کی طاقت نہ رکھیں گے۔

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۸۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَا يَكِبِّرُ الَّذِينَ يَتَحَلَّونَ بِمَا أَنْتَ هُنَّ أَنْفُسُهُمْ فَضْلًا هُوَ خَيْرٌ لَهُمْ بِلَهُ شَرٌّ لَهُمْ سَيِّطُونَ يَا كُلُّوَابِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ (۲۷)

”اور خبردار جو لوگ خدا کے دے ہوئے میں بخل کرتے ہیں ان کے بارے میں یہ نہ سوچنا کہ اس بخل میں کچھ بھلانی ہے۔ یہ بہت برا ہے اور عنقریب جس مال میں بخل کیا ہے وہ روز قیامت ان کی گردان میں طوق بنا دیا جائے گا“...

اسی طرح تمام اعمال اپنی مناسب صورت میں مجسم ہوں گے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ علم و سائنس نے ثابت کیا ہے کہ کوئی بھی چیز دنیا میں نابود نہیں ہوتی ہے بلکہ مادہ اور قوت (ازبج) ہمیشہ اپنی شکل و صورت بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے افعال اور اعمال بھی نابود ہوئے بغیر ان دونوں صورتوں سے خارج نہیں ہیں اور اس قانون کے حکم کے مطابق جاودا نی اور ابدی حالت میں ہیں، اگرچہ ان کی شکل و صورت بدلتا ہے۔

قرآن مجید ایک مختصر اور لرزہ خیز عبارت میں قیامت کے بارے میں فرماتا ہے:

(وَوَجَدَ وَا عَمِلُوا حاضرًا) (سورہ کہف ۴۹)

”اور سب اپنے اعمال کو بالکل حاضر پائیں گے“

حقیقت میں انسان جو کچھ پاتا ہے وہ اس کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے، لہذا خداوند متعال اسی آیت کے ذیل میں فوراً فرماتا ہے:

(وَلَا ظُلْمَ رَبِّكَ اَحَدٌ) (سورہ کہف ۴۹)

”تمھارا پروردگار کسی ایک پر بھی ظلم نہیں کرتا ہے“

ایک دوسری جگہ پر سورہ زلزال کی آیت نمبر ۶ میں فرماتا ہے:

(يَوْمَ نَذِيرٌ يَصُدُّ رَبِّ النَّاسِ اشْتَأْلِيْرُ وَالْعَمَالُ هُمْ (

”اس روز سارے انسان گروہ در گروہ قبروں سے نکلیں گے تاکہ اپنے اعمال کو دیکھیں۔“

اسی سورہ زلزال کی آیت نمبر ۷ اور ۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

(فَمَنْ يَعْمَلْ مُثْقَلًا ذَرَّةٌ خَيْرٌ وَمَنْ يَعْمَلْ مُثْقَلًا ذَرَّةٌ

”پھر جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر اُنی کی ہے وہ اسے دیکھے گا“

ذکر آیات میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ فرماتا ہے کہ خود ان اعمال کو دیکھے گا۔

اس حقیقت کو مد نظر رکھنا یعنی اسی دنیا کے ہمارے چھوٹے بڑے اور نیک و بد اعمال کا محفوظ اور ثابت رہنا اور نابود نہ ہونا اور قیامت کے دن ہر جگہ ان کا ہمارے ساتھ رہنا سب کے لئے ایک انتباہ ہو سکتا ہے تاکہ ہم اپنے برے اعمال اور گناہوں کے مقابل ہوشیار ہیں اور اپنے نیک اعمال کے چاہنے والے اور ان پر ثابت قدم رہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ دو حاضر میں ایسے آلات ایجاد کئے گئے ہیں کہ اس مسئلہ کے ایک حصہ کو اسی دنیا میں ہمارے لئے جسم کیا جاسکتا ہے: ایک دانشور لکھتا ہے: سائنس دان آج مصری کمہاروں کی دوہزار سال قدیمی آواز کو اسی طرح منعکس کر سکتے ہیں کہ وہ آواز سننے کے قابل ہے۔ کیونکہ مصری عجائب گھروں میں دوہزار سال پرانے کوڑے موجود ہیں کہ انھیں مخصوص چرخوں اور ہاتھوں سے بناتے وقت کمہاروں کی آواز کی لہریں کوزوں کے جسموں میں نقش ہو گئے ہیں اور آج ان لہروں کوئئے سرے سے اس طرح زندہ کیا جا رہا ہے کہ ہم اپنے کانوں سے انھیں سن سکتے ہیں (۱)۔ بہر حال مسئلہ معاد اور قرآن میں ذکر شدہ نیک لوگوں کی ابدی جزا اور بد کاروں کی دامنی سزا کے بارے میں بہت سے سوالات کا جواب ”اعمال کے جسم ہونے“ اور ہر ا۔ کتاب ”راہ طے شدہ“ سے مأخوذه۔

اچھے اور برے کام کے انسان کے جسم و روح پر اثر ڈالنے اور اس اثر کے ہمیشہ ہمارے ساتھ رہنے کے پیش نظر دیا جاسکتا ہے۔

## غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ جسمانی معاد سے مراد کیا ہے؟

۲۔ جسمانی معاد کے مکرین کیا کہتے ہیں اور قرآن مجید ان کا کیسے جواب دیتا ہے؟

۳۔ جسمانی معاد کے لئے عقلی استدلال کیا ہے؟

۴۔ عدل و انصاف کے قانون اور جسمانی معاد کے درمیان کون سارا بڑھے ہے؟

۵۔ شبہ ”آکل و ماکل“ سے مراد کیا ہے اور اس کا جواب کیا ہے؟